دِلاسا

(طنز و مزاح)

تاجؔ یہی ہے زیست کا حاصل
شوقِ تبسم ، دیدۂ گریاں

فاطمہ تاج

تاریخ وسنِ اشاعت: ۱۵ر ڈسمبر ۱۹۹۳ء
تعدادِ اشاعت: ۵۰۰
قیمت: ۳۰/- روپے
طباعت: اعجاز پرنٹنگ پریس، چھتہ بازار۔ حیدرآباد
ناشر: فاطمہ تاج
پتہ: ۳۳۹ - ۳ - ۲۲، مگر باؤلی - میر چوک۔
حیدرآباد - ۵۰۰۰۰۲

کتاب ملنے کے پتے:-

* حسامی بک ڈپو - مچھلی کمان - پتھر گٹی - حیدرآباد
* الکتاب - گن فاؤنڈری - حیدرآباد
* مصنفہ - ۳۳۹ - ۳ - ۲۲، مگر باؤلی - میر چوک
حیدرآباد - ۵۰۰۰۰۲

اِنتساب

تاجؔ کے سرتاج کے نام
جو حبیب احمد بالفقیہ
کے نام سے جانے جاتے ہیں

فاطمہ تاجؔ

ترتیب وتزئین

صفحہ نمبر

۱۲۰

پیش لفظ

طنز و مزاح کے فروغ کے لئے حیدرآباد نے جو کارہائے نمایاں انجام دیئے ہیں ان میں خواتین کا حصہ قابلِ قدر بھی ہے اور پُر وقار بھی۔ آزادی سے قبل آصف جہاں بیگم اور جہاں بانو نقوی اور بعد میں زینت ساجدہ نے اپنی تخلیقی صلاحیتوں کو بروئے کار لاکر اس لطیف رجحان کی لطافتوں پر "صنفِ کثیف" کی اجارہ داری قائم ہونے نہیں دی۔ گل افشانی گفتار کی اس روایت پر عمل کرتے ہوئے فاطمہ عالم علی خاں، ڈاکٹر رشید موسوی، ڈاکٹر لئیق صلاح، ڈاکٹر حبیب ضیاء اور بعض دوسری خوش دل خاتون ادیبوں نے اپنی کاوشوں کے ذریعہ طنز و مزاح کی زلفیں سنواریں۔ مزاح کی گھنیری زلفوں تلے، وقت کی تپتی دھوپ کے مسافروں نے اپنی آبلہ پائی کو بھول کر آسودگی محسوس کی۔ حیدرآباد طنز و مزاح کا مرکزِ ثقل بن گیا۔ طنز و مزاح کا کارواں آگے بڑھتا گیا اور پھر اس کارواں میں ایک اور خاتون فاطمہ تاج شامل ہوگئیں۔ جن کی مختلف النوع نثری و شعری تخلیقات پے درپے اخباروں اور رسالوں کی زینت بننے لگیں۔

عام طور پر نئے ادیب یا شاعر بتدریج شہرت کے منازل طے کرتے ہیں لیکن فاطمہ تاج حیدرآباد کے ادبی اُفق پر اچانک نمودار ہوئیں۔ ان کی تحریر کی دلکشی نے ادب کے قاری کو حیرت زدہ کر دیا۔ ان کی نگارشات سے صرفِ نظر ممکن نہ تھا کہ ان میں تنوع، گہرائی و گیرائی کے ساتھ زبان کی چاشنی بھی ہے۔ پتہ چلا کہ طالب علمی کے دور میں فاطمہ تاج کو ادب کا چسکہ تھا۔ لیکن وقت نے برسوں اس آگ کو دبائے رکھا اور جب سوتے اُبل پڑے، باندھ ٹوٹ گیا تو

تخلیق کار کی آہِ آتشیں نے گویا بالِ عنقا کو جلا کر رکھ دیا۔ کبھی قفس تھا اور ماتم بال و پر کا۔ اور پھر یوں ہوا کہ یکے بعد دیگرے شاعری، افسانوں اور مضامین کے مجموعے منظرِ عام پر آئے اور اب فاطمہ تاج کے مزاحیہ مضامین اشاعت پذیر ہیں۔

فاطمہ تاج کی شاعری اور نثر دونوں کے اوصاف جداگانہ ہیں۔ ان کی شاعری رنج و الم سے عبارت ہے۔ "زیست کو شاداں نہ کر سکنے" کا انھیں شدید احساس ہے۔ شاعری میں "چشمِ پُرنم سے ماحول کو آب دیدہ دیکھنے" والی فاطمہ تاج اپنے مضامین میں اپنی ہی (اجتماعی طور پر سماج کی) محرومیوں پر قہقہہ زن نظر آتی ہیں۔ ان ہی کا شعر ہے ؎

ہم قہقہہ زن اپنی ہی محرومیوں پہ ہیں
اس طرح آرزو کو نبھا کر رہے ہیں ہم

فاطمہ تاج کے مضامین تازگی، شوخی و بذلہ سنجی کا مرقع ہیں۔ انھوں نے مزاح کو سطحی انداز میں نہیں برتا۔ ان کا غم 'شرارہ بن کر رنگ و پے میں اترتا اور نوکِ قلم سے کبھی طنز اور کبھی ہلکے' مزاح کی صورت میں عیاں ہوتا ہے۔ کرشن چندر نے کہا تھا کہ "مزاح نگار ادب کے صدف میں ایک آنسو کو منجمد کر کے اسے دُرِ آبدار بناتا ہے اور ہنسی کی پرتوں میں ٹٹول ٹٹول کر آنسوؤں کی نرمی، گرمی اور تیزی ڈھونڈنا مہذب قاری کا کام ہے۔

ماضی کا مزاح جو بیشتر جاگیردارانہ نظام کا پروردہ تھا۔ جذبۂ افتخار کے خمیر سے اٹھا تھا۔ اس لئے اُس دور کے مزاح کی حدیں تمسخر سے جا ملتی ہیں۔ آج کا شائستہ مزاح "تو ہنسانے کو ہنساتا ہے مگر دل گیر ہے" کی تفسیر ہے۔

فاطمہ تاج کے مزاح میں اسی کیفیت کی جھلکیاں نظر آتی ہیں۔ عصری مزاح میں جذبۂ افتخار کی جگہ ہمدردی کے جذبہ نے لے لی ہے۔ خواتین میں ہمدردی کا جذبہ کچھ زیادہ ہی ہوتا ہے۔ وہ ذرا سی کجی، نا انصافی یا ظلم برداشت نہیں کر پاتیں۔ آنکھ اشکبار ہو جاتی ہے۔ ہمدردی کی اس لہر میں نرمی ہو، رواداری ہو تو مزاح کے راستے کھل جاتے ہیں اور غصہ، احتجاج، جھنجھلاہٹ یا راہ راست پر لانے کی کوشش طنز کی صورت اختیار کرتی ہے۔

فاطمہ تاج نے بڑے خنک، سبک اور شیریں انداز میں مختلف موضوعات پر قلم اٹھایا ہے۔ انہوں نے اس کتاب کا نام "دلاسا" رکھا ہے۔ گویا ان کے مضامین محض ہمدردی کا اظہار نہیں بلکہ ایک قدم آگے بڑھ کر دلاسا بھی دیتی ہیں۔

فاطمہ تاج کے مضامین کے مطالعہ سے اندازہ ہوتا ہے کہ وہ ہر طرح کے موضوع پر لکھنے کی قدرت رکھتی ہیں۔ اخبار "سیاست" پر لکھا ہوا ان کا مضمون اس کی بہترین مثال ہے۔ زبان نہایت سہل، دل کو چھونے والی، غیر ضروری ثقیل الفاظ و تراکیب سے عاری، چھوٹے چھوٹے نپے تلے جملے، لہجہ میں شگفتگی، خیالات میں روانی ہے۔ جن پر فکر کی دبیز تہہ چڑھی ہوئی ہے۔

فاطمہ تاج شعر بھی کہتی ہیں۔ افسانے، خاکے، رپورتاژ اور نہ جانے کیا کچھ لکھتی ہیں۔ مجھے ڈر ہے کہ شاعر کی حیثیت سے شاعروں کے ہجوم اور شاعری کی دنیا میں وہ کھو نہ جائیں ـــ جب کہ وہ اپنے مزاج

کی مناسبت سے اُردو طنز و مزاح کی کائنات میں رنگ بھر سکتی ہیں۔

میں " دلاسہ " کی اشاعت پر فاطمہ تاج کو دلی مبارکباد پیش کرتا ہوں اور مستقبل کے لئے ان سے بہتر توقعات وابستہ کرتا ہوں ۔

یکم ڈسمبر ۹۳ء

ڈاکٹر سید مصطفیٰ کمال
مدیر "شگوفہ" و صدر شعبۂ اُردو انوار العلوم کالج
حیدرآباد

رفیعہ منظور الامین

اُردو ظرافت کے میدان میں ایک اور آواز

فاطمہ تاج کو اپنی تحریر پر قدرت حاصل ہے۔ وہ ایک تابناک شعور کی مالک ہیں۔ ایک جگہ لکھتی ہیں۔

"اندھیری رات ہی میں تو چراغ جلانے کی تمنا ہوتی ہے اور دُور تک پھیلے ہوئے اندھیرے پر ایک چراغ کی روشنی غالب آجاتی ہے"

شعور کا یہ نور انھوں نے کہاں سے حاصل کیا، اس پر مجھے اپنے شوہر منظور الامین صاحب کے دو شعر یاد آئے ؎

سینۂ انساں کے اندر ہی نہاں وہ طُور ہے
وا ہو چشمِ دل تو پیدا معرفت کا نور ہے

دل کے اندر ہی تو ملتا ہے سراغِ زندگی
اس نہاں خانے میں جلتا ہے چراغِ زندگی

—— خود آگہی کی منزل تک وہ اسی طرح تو پہنچی ہیں۔

زیرِ نظر "دلاسہ" ایک گلدستہ ہے جس میں بہت سارے خوش نما اور خوش رنگ پھول ہیں، جن کی مہک پڑھنے والوں کے ذہن و دل میں رچ بس جاتی ہے ان شوخیوں اور شوخ نگارشوں کی مصنفہ فاطمہ تاج بحیثیت ادیب و شاعر

محتاج تعارف نہیں۔

کہتے ہیں گفتگو میں مزاح کو وہی مرتبہ حاصل ہے جو کھانے میں نمک کو ہوتا ہے۔ بات میں جب ظرافت کی چاشنی ہوتی ہے تو بات ' بات کہی جا سکتی ہے۔ کچھ ایسی ہی خوبصورت اور خوشگوار باتوں کے حامل ہیں فاطمہ تاج کے یہ مضامین۔ ان کے یہاں آپ کو مزاح اور طنز کا ایک اچھا امتزاج ملے گا۔ اس میدان میں بقول انہیں کے انھوں نے کچھ "تجربات" کرنے کی غرض سے قدم رکھا ہے۔ یہ ایک نیک فال ہے۔ فن میں جب بھی تجربے کئے جائیں تو ان کا خیر مقدم کرنا چاہیئے۔ لہذا ان چند لفظوں کے ساتھ اُردو ظرافت کے میدان میں فاطمہ تاج کو میں خوش آمدید کہتی ہوں۔

۱۵ر نومبر ۱۹۹۴ء

(بنجارہ ہلز۔ حیدرآباد)

فاطمہ تاج کی بے ساختہ تحریریں

فاطمہ تاج کا شمار حیدر آباد کی اُن خواتین میں کیا جا سکتا ہے، جنھوں نے بہت کم عرصے میں اپنا ایک منفرد مقام بنالیا ہے۔ حیدر آبادیوں کیلئے ان کی شخصیت محتاج تعارف نہیں۔ اخبار سیاست اور محفلِ خواتین کے ذریعے انھوں نے اپنی شناخت بنائی۔ وہ بہ یک وقت ایک کامیاب افسانہ نگار بھی ہیں اور باصلاحیت شاعر بھی، اور اب ان کے مزاحیہ مضامین کا یہ مجموعہ زیورِ طبع سے آراستہ ہوکر قارئین سے داد و تحسین چاہتا ہے۔

اِس مجموعے میں (۲۲) مضامین شامل ہیں۔ مضامین کی خصوصیت یہ ہے کہ یہ عام موضوعات سے ہٹ کر لکھے گئے ہیں۔ طنز و مزاح لکھنا ہر کسی کے بس کی بات نہیں۔ یہ وہ صلاحیت ہے جو خداداد ہوتی ہے۔ فاطمہ تاج کے مضامین پڑھنے سے اندازہ ہوتا ہے کہ مزاح لکھنے کی ان میں فطری صلاحیت ہے۔ موضوع کے انتخاب میں انھیں کسی قسم کی دِقت پیش نہیں آتی۔ وہ موضوع کا انتخاب اپنے ہی اطراف و اکناف کے ماحول سے کرتی ہیں۔ روانی اور تسلسل کو برقرار رکھتے ہوئے ایک ہی نشست میں اپنا مضمون مکمل کرلیتی ہیں۔

زیرِ نظر مجموعے "دلاسہ" کے کئی مضامین ایسے ہیں جو قاری کو دعوتِ فکر دیتے ہیں۔ بعض مضامین خالص مزاحیہ ہیں اور بعض میں مزاح کے ساتھ طنز کے نشتر

بھی ملتے ہیں ۔

فاطمہ تاج کو زبان پر کامل عبور حاصل ہے ۔ افسانہ نگاری میں انھوں نے اپنی بہترین صلاحیتوں کا لوہا منوایا ہے ۔ مضمون " خزانہ میری تلاش میں ہے " کے چند جملے ملاحظہ ہوں ۔

" ہم نے سنگھار میز کے آئینے میں نہ صرف اپنا سراپا خود اعتمادی سے دیکھا ، بلکہ اُن آنکھوں کو بے ساختہ چوم لیا جو شدت خوف و غم سے بہنے لگی تھیں ۔ نور کی یہ برسات اتنی شدید تھی کہ ہمارے دل سے عاشقانہ مزاج رکھنے والے " جن " کا خیال بھی بہہ گیا ۔ ہم کو آیۃ الکرسی بھی یاد آچکی تھی ۔ "

طنز و مزاح سے بھرپور ایک مضمون " ہم اور ہمارے ڈاکٹر " ہے ۔ اس میں انھوں نے ڈاکٹروں کی مشترکہ خصوصیات کا تذکرہ بڑے دلچسپ انداز میں کیا ہے ۔ ڈاکٹروں کے بارے میں لکھتی ہیں ۔

" ہمیں یہ مسیحائی آج تک سمجھ میں نہیں آئی کہ ہم چاہے کوئی بھی تکلیف بیان کریں ، ڈاکٹر پہلے خوش رہنے کی تاکید کرتے ہیں اور بعد میں دوائیں تجویز کرتے ہیں ۔ پھر اس کے بعد کچھ پرہیز کی بھی ہدایت کرتے ہیں ۔ "

" تہذیب کے انڈے " بھی طنزیہ کی بہترین مثال ہے ۔ مشرقی اور مغربی تہذیب کا موازنہ خوب ہے ۔ مضمون کے چند جملے ملاحظہ ہوں ۔

" حضرت نے کہا ' پہلے آملیٹ بنے گا یا پڈنگ ؟ ہم نے کہا '

پہلے آملیٹ پھر پڈنگ۔ تو بولے خدا بھلا کرے انگریزوں کا جو آملیٹ اور پڈنگ تو سکھا گئے مگر خوش اخلاق مرغی کی وہ نسل اپنے ساتھ لے گئے جو تہذیب کے انڈے دیا کرتی تھی۔ اور ہم اُس زمانے میں آملیٹ یا پڈنگ کے ہرگز عادی نہ تھے۔ ہم مشرقی انداز میں جینے والے لوگ مشرقی کھانے ہی کھایا کرتے ہیں۔ آج کل تو ہماری تہذیب کا سورج مغرب سے نکلنے لگا ہے اس لئے تہذیب کے انڈے مل نہیں پا رہے ....."

ان مضامین کے علاوہ "دلاسہ" میں طنز و مزاح سے بھرپور اور بھی مضامین مل گے۔ اس مجموعے کی اشاعت پر میں فاطمہ تاج کو دلی مبارکباد دیتی ہوں، اور اُمید کرتی ہوں کہ وہ خوب سے خوب تر کی طرف رواں دواں رہیں گی۔

۱۸/ نومبر ۱۹۹۳ء

ڈاکٹر حبیب ضیاء
پروفیسر شعبۂ اُردو
یونیورسٹی کالج فار ویمن جامعہ عثمانیہ

"اندازِ بیاں گرچہ بہت شوخ نہیں ہے"

پھر بھی یقین ہے کہ کہیں نہ کہیں قارئین کو میری تحریر "مسکراہٹ" کا سامنا کرنا ہی پڑے گا۔ قارئین نے سمجھا ہو گا کہ میں شعروادب کا میدان چھوڑ چکی ہوں۔ جی نہیں! ؎

"ہم نے اپنے جی میں ٹھانی اور ہے"

قطعی طور پر یہ فیصلہ کر چکی ہوں کہ ادب کی زمین کا کوئی بھی گوشہ میں خالی نہیں چھوڑوں گی۔ مضمون نگاری، افسانہ نگاری، تبصرہ نگاری، طنز و مزاح، شاعری غرض کہ میں اپنی نگارشات کے ڈھیر لگا دوں گی۔ چاہے سامعین کی سمع خراشی ہو یا قارئین کا ذہن الجھ کر رہ جائے، مجھے پرواہ نہیں، کیونکہ یہ قارئین کرام ہی کی مسلسل حوصلہ افزائیوں کا ہی نتیجہ ہے نا!

میں برسوں سے سب کی تخلیقات پڑھتے جارہی ہوں، پڑھتے جارہی ہوں۔ آخر مجھ پر بھی مطالعہ کے اثرات نمایاں ہوں گے کہ نہیں ....؟

مجھے خود خبر نہیں کہ میں نے طنز و مزاح کی راہوں پر کس طرح قدم رکھا، لیکن یہ بات تو ثابت ہے کہ طنز و مزاح انسان کی فطرت کا جز ہے، ہے نا؟ اب اگر میں کچھ تجربات کرنے پر آمادہ ہوں تو کسی کو بھی اعتراض نہیں ہونا چاہیے .....!

ویسے بھی شوخی وہ رنگین نقاب ہے جسے غم کے سیاہ پیکر پر اگر ڈالا جائے تو چہرۂ غم بھی حسین لگتا ہے۔ اندھیری رات میں ہی تو چراغ جلانے کی تمنا ہوتی ہے اور دور تک پھیلے ہوئے اندھیرے پر ایک چراغ کی روشنی غالب آجاتی ہے، آتی ہے نا؟ زندگی میری نظر میں اُس شاداب گلشن کی طرح ہے جس کی نگہبانی کرتے کرتے باغبان کے ہاتھ نہ صرف زخمی ہو جاتے ہیں بلکہ نظروں میں بھی "کھٹک" محسوس ہونے لگتی ہے۔ کھلے ہوئے تر و تازہ پھول دیکھ کر باغباں یہ بھول جاتا ہے کہ وہ زخمی ہے........!

ادب میں اسی لئے طنز و مزاح کا بہت اہم مقام ہے کہ مطالعہ کے شوقین لوگ طنز و مزاح سے ہمیشہ لطف اندوز ہوتے ہیں۔ سنجیدہ اور غمگین لوگوں کے چہرے پر لمحہ بھر کی مسکراہٹ عرصۂ حیات میں اضافہ کر ہی دیتا ہے۔

بہر حال نئے نئے تجربے کرنا مجھے پسند ہے، سو میں کرتی رہتی ہوں۔ قارئین کرام سے گذارش ہے کہ طوعاً و کرہاً ہی سہی میرا "دلاسہ" قبول فرمائیں۔

کسی کے غم کو کم کرنا میرے تو بس کی بات ہے ہی نہیں، مگر میں عادتاً دوسروں کو مسکراتے ہوئے دیکھنا پسند کرتی ہوں۔ یہ کیا کہ ہر طرف آنسوؤں کے دھارے ہوں، آہوں کی آندھیاں ہوں؟ کبھی تو موسم بدلا ہوا نظر آنا چاہیئے، کہیں تو نسیم صبح کی مسکراہٹ گل کھلاتی نظر آئے، غم کی جاودانی تسلیم! لیکن عارضی لمحوں میں ہنسنے مسکرانے سے کبھی گریز نہیں کرنا چاہیئے۔ اللہ تعالیٰ نے فطرت کے سنجیدہ و رنجیدہ گوشوں میں بھی شوخیوں کے گل دستے سجا رکھے ہیں۔ اسی گل دستے کے ہر پھول کے رنگ سے اس کی خوشبو سے مستفید ہونا چاہتی ہوں اور سب کے لئے بھی وہی پسند کرتی ہوں جو اپنے

لئے پسند کرتی ہوں۔ جو لوگ شوخیٔ فطرت پر سنجیدگی سے غور نہیں کرتے وہ قدرت
کی عطا کی ہوئی سُرور بخش کیفیت سے محروم رہتے ہیں۔

شعری مجموعہ "اب کے برس" پھر افسانوں کا مجموعہ "آس پاس" اور پھر ادبی
مضامین کا مجموعہ "امانت" کے بعد اب "دلاسہ" پیشِ خدمت ہے۔ حسبِ سابق
اس کتاب کی بھی اشاعت کا مرحلہ نیّر بھائی (صلاح الدین نیّر) کے تعاون اور محنت سے
ہی طے ہوا۔ مجھے تو بس لکھنا آتا ہے، سو لکھ دیتی ہوں، نیّر بھائی کے تعاون کی
تہہ دل سے شکر گزار ہوں۔ خدا انہیں صحت و سلامتی عطا فرمائے اور حسبِ روایت
ان کی حوصلہ افزائی، تعاون اور رہنمائی ہمیشہ مجھے حاصل رہے۔ آمین۔

میں اُن مہربان ہستیوں، محترمہ رفیعہ منظور الامین صاحبہ، محترم ڈاکٹر مصطفےٰ کمال
صاحب اور محترم پروفیسر حبیب ضیاء صاحب کی بھی شکر گزار ہوں جنھوں نے اس
کتاب پر اظہارِ خیال کرتے ہوئے اپنا قیمتی وقت مجھے دیا اور مجھے اپنی مخلصانہ رائے
سے نوازا۔

فاطمہ تاج

۲۵ر نومبر ۱۹۹۳ء

"خزانہ میری تلاش میں ہے

یقین کیجئے، میں کسی خزانے وزانے کی تلاش میں ہرگز نہیں ہوں بلکہ خزانہ میری تلاش میں ہے۔ آپ میری دماغی حالت پر بخدا شک نہ کیجئے۔ میں آپ کو ساری روداد سناتی ہوں۔

ہوا یوں کہ کچھ دن پہلے سرِشام ہم گھر کے قریب والے ہاسپٹل جارہے تھے۔ ایک موڑ پر مخالف سمت سے ایک "باریش بزرگ" نے ہمارے سامنے آکر راستہ روک دیا۔ ہم نے نظر اُٹھائی تو وہ بزرگ یوں گویا ہوئے۔ "تیری آنکھوں پر جن عاشق ہوا ہی چاہتا ہے اور تجھے خزانہ بھی دینے والا ہے۔ وہ عنقریب تجھے ملنے والا ہے۔" یہ کہہ کر وہ صاحب تیز رفتاری سے ہمارے آگے نکل گئے اور ہم من من بھر کے قدم اُٹھاتے ہوئے ڈاکٹر کے پاس پہنچے۔ نہ جانے خشک گلے اور کانپتے ہونٹوں سے کیا کیفیت بیان کی کہ نیند کی گولیاں تجویز کی گئیں، جنہیں لے کر ہم لڑکھڑاتے قدموں سے گھر لوٹ آئے اور ذرا سنبھلتے ہوئے اُن "بزرگ صاحب" کے بیان پر غور کرنے لگے۔ اس کے بعد کمرے کا دروازہ بند کر کے ہم زندگی میں پہلی بار آئینے کے سامنے کھڑے ہو کر اپنی ان آنکھوں کا بغور جائزہ لینے لگے جن میں ابھی تک اُمیدوں کی شمعیں روشن تھیں۔ ہم بڑی دیر تک اپنی آنکھوں میں دیکھتے رہے اور سوچتے رہے کہ آخر ان آنکھوں پر کسی انسان کو عاشق ہونے کی توفیق کیوں

نہ ہوئی؟ اور "جن صاحب" کو لاکھوں "نیم باز" آنکھوں کو چھوڑ کر ہماری آنکھوں میں ایسا کیا نظر آیا کہ وہ عاشق ہونے پر تُلے بیٹھے ہیں؟ ہماری آنکھوں میں خوف کے سائے لہرانے لگے۔ ہم نے امکانات کا جائزہ لیا۔ اماں کہا کرتی تھیں "کھلے بال رکھ کر زیرِ سماں نہ جاؤ، آنکھوں کے پاس کالا ٹیکہ ہمیشہ لگا رہنے دو، ورنہ "جن" عاشق ہو جاتے ہیں۔ بھلا بچپن میں کون سمجھ سکا ہے ان رازوں کو، لیکن ہم جب کھلے بال زیرِ سماں جھاڑوں کے نیچے جھولا جھولتے تھے تب "جن صاحب" نے ہم کو کیوں پسند نہیں کیا؟ عاشق ہونے کی تیاری اس عمر میں ہو رہی ہے جب عشق کا دیوتا اپنے لطیف و سحر انگیز اثرات کو گٹھڑی میں باندھ کر زندگی سے کوچ کر جانے کے لئے تیار کھڑا ہے اور ہم سے اجازت طلب کر رہا ہے، اب اگر ہم اس عشق کے دیوتا کو خدا حافظ کہہ دیں تو پھر "جنّ" کے لئے جگہ خالی ہو جاتی ہے۔ ہم ان ہی خیالات میں گم نیند کی گولی کھا کر جیسے سو گئے تو نہ جانے کیوں پچھلے پہر رات کو خود بخود ہماری آنکھ کھل گئی۔ ہم نے اپنے برابر میں سوئے ہوئے مجازی خدا کو دیکھا معاً دل میں یہ خیال آیا کہ "جن" نے کہیں ہمارے مجازی خدا کا بھیس تو نہیں بدل ڈالا؟ ہم نے باقاعدہ ہمارے سوئے ہوئے "مجازی خدا" کو گھورنا شروع کیا۔ ایسا بالکل پہلی بار کیا تھا۔ ہم نے ہمارے "مجازی خدا" کو صرف دیکھا تھا، زندگی بھر دیکھتے رہنے کی آرزو میں گزر گیا تھا لیکن اس طرح ٹکٹکی لگا کر دیکھنے کا یہ پہلا موقع تھا! مسلسل گھورے جا رہے تھے۔ بے چارے ہمارے مجازی خدا ساری خدائی سے بے خبر خوابوں میں گم تھے۔

اچانک گھڑیال نے دو زوردار گھنٹے۔ بجائے، یعنی رات کے دو بجے تھے امّاں کہا کرتی تھیں "رات کے دو بجے بعض قرآنی آیات کا ورد کرنے سے "جن" حاضر ہو جاتا ہے۔ ہم نے سوچا کیوں نہ ہم "جن" کو حاضر کر کے تنبیہہ کریں کہ اس نے ایسا بیہودہ فیصلہ ہمارے لئے کیوں کر رکھا ہے؟ کیوں ہماری آنکھوں کو بے نور کرنے پر تُلا ہے؟ ہماری آنکھوں میں اُمیدوں، آرزوؤں اور حسین خوابوں کا نورانی سمندر ٹھاٹھیں مارتا رہتا ہے اور یہ "ناری مخلوق" بلاوجہ اس میں غوطہ لگا کر اس کو آلودہ کرنا چاہتی ہے لیکن پھر یہ خیال آیا کہ اگر "جن" حاضر ہو جائے اور ہمارا جواب دینے کے بجائے فوراً ہی عاشق ہو بیٹھے تو۔۔۔۔؟

صبح تک ہم "جن" کو آنکھوں میں بسائے ہوئے اپنے مجازی خدا کے آگے کتنے شرمندہ ہو جائیں گے؟ انھیں بجائے سکون و راحت اور خوشی دینے کے "تحفۂ آتشیں" پیش کرنے کے مرتکب ہو جائیں گے۔ بہر صورت ہم نے یہ ارادہ بھی ترک کر دیا۔ ہم اپنے آپ کو بھولتے جا رہے تھے۔ دل میں خوف سمایا ہوا تھا کہ نہ جانے کب خزانہ ہمارے دربار میں پیش کر دیا جائے اور ہم اپنی آنکھوں سے ہاتھ دھو بیٹھیں۔۔۔۔!

کسی طرح صبح ہوئی۔ بچّے معمول کے مطابق اسکول و کالج جا چکے تھے۔ ہمارے "مجازی خدا" بھی نکل پڑے۔ ہم اپنے ڈرائینگ ہال میں تنہا بیٹھے رہے اور آنے والے حالات پر غور کرتے رہے۔ خادمہ باورچی خانے میں اپنے کام میں مصروف تھی۔ ہال میں لگی گھڑیال نے بارہ بجائے۔ اچانک بہت زوردار قسم کی گڑگڑاہٹ سنائی دینے لگی۔ جیسے کوئی بڑی سی دیگ لڑھکائی جا رہی ہو۔۔۔۔

کال بیل کی آواز سنتے ہی ہم نے چیتے کی طرح اپنے کمرے کی طرف چھلانگ لگائی اور اپنی دانست میں خود کو محفوظ کر لیا۔

ہماری شخصیت، قد و قامت، وضع قطع کے اعتبار سے نمایاں اور وزن دار ہے۔ اس کے باوجود ہم "بید لرزاں" بنے ہوئے تھے۔ دل کی دھڑکن بے ترتیب ہو گئی تھی۔ ہم وحشت میں آیتہ الکرسی بھی بھول چکے تھے۔ ہمارا عاشق ہمارے در پر خزانے کی دیگ لئے کھڑا تھا اور ہم بجائے استقبال کرنے کے مرے جا رہے تھے۔ بخدا کبھی طرح ہم اِس جن کے ساتھ جانے کے لئے راضی نہ تھے جو خزانہ دے کر ہمیں لینے آیا تھا۔ ہم خوشی، خوشی ملک الموت کے ساتھ جانے کے لئے تیار تھے مگر اِس نامراد عاشق کی صورت بھی دیکھنا نہیں چاہتے تھے۔

یکایک ہمارے بند کمرے کے دروازے پر زور، زور سے دستک ہونے لگی ساتھ ہی خادمہ کی آواز بھی سنائی دی "بی بی! گیس سلنڈر والا آیا ہے ......" ہم نے سنگھار میز کے آئینے میں نہ صرف اپنا سراپا خود اعتمادی سے دیکھا بلکہ اُن آنکھوں کو بے ساختہ چوم لیا جو شدتِ خوف و غم سے بہنے لگی تھیں۔ تو کیا یہ برسات اتنی شدید تھی کہ ہمارے دل سے عاشقانہ مزاج رکھنے والے "جن" کا خیال بھی بہہ گیا ہم کو آیتہ الکرسی بھی یاد آ چکی تھی۔ ہم نے حصار باندھ کر اپنے آپ کو بڑا پُر سکون محسوس کیا۔ ہم اپنے "مجازی خدا" کے آگے شرمسار ہونے سے بچ گئے تھے اور عشق کے دیوتا کو پھر اصرار کر کے روک لیا تھا۔ تحریر ختم کرتے کرتے "حواسِ خمسہ" نے مجھ سے یہ سرگوشی کی ہے کہ "جن" اپنے عشق کا ڈھونگ رچا کر میری "چشم زنبیل" سے چھپے ہوئے لعل و گہر چُرانا چاہتا ہے تاکہ وہ اپنے خزانے میں اضافہ کر سکے، لیکن اب میں اپنی آنکھیں ہمیشہ کھلی رکھوں گی۔

■■

"ہمیں بھی جشن کی سُوجھی"

رات کو ہم اپنے بستر پر لیٹے لیٹے سوچنے لگے کہ سارے شہر میں حیدرآباد کا "جشنِ چار سو سالہ" منایا جا رہا ہے۔ سرکاری عمارتوں پہ رنگ و روغن ہے بڑی سڑکوں کے فٹ پاتھ اس قدر صاف ہیں کہ وہاں اب راہرو بھی کم نظر آرہے ہیں۔ بہ "الفاظِ دیگر" میدان صاف ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ !

کہیں نصب کئے ہوئے مجسمے چمکائے جا رہے ہیں تو کہیں رنگ برنگی جھنڈیاں لگ رہی ہیں اور بھی کئی طرح کی تیاریاں جاری ہیں۔ ہم نے لیٹے لیٹے ہی سوچا۔ کیوں نہ ہم بھی اِس جشن میں شریک ہو جائیں بلکہ یہ جشن تو ہر فرد کو شخصی طور پر منانا چاہیئے تو کیوں نہ یہ ابتدا ہم ہی کر دیں ۔ ۔ ۔ ۔ ؟

اور پھر ہوا یوں کہ ہم "سوپر مین" کی طرح اُڑنے لگے ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ اونچا بہت ہی اونچا ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ ہم نے کئی خزاں رسیدہ درخت جو سڑکوں کے کنارے بدنما لگ رہے تھے "اُکھاڑ پھینکے۔ کچرے کی کئی کنڈیاں کچرے کے ساتھ پھیل کر بیچ سڑک پر آگئی تھیں۔ ہم نے اُنھیں ایک ٹھوکر میں "ٹھکانے" لگا دیا ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ پھر اس کے بعد ہم اُن عمارتوں پر ہاتھ پھرا کر رنگ برسانے لگے جو سیاہی مائل ہونے لگی تھیں، ہم نے اِن بدنما بجلی کے کھمبوں کو بھی اکھاڑ پھینکا جہاں پر تاروں کے گچھے خوفناک انداز میں مکڑی کے جالوں کی طرح لٹک رہے تھے۔ کچھ ٹیلی فون کے

جھکے ہوئے کھمبوں کی کمر سیدھی کی وہ بھی اس لیے کہ ہمیں بھی ٹیلیفون سے "ربطِ خاص" ہے اور دورانِ جشن بہت کام آنے والی چیز ہے نا ٹیلی فون؟ اور پھر ہم نے "تالاب کے کنارے نصب کردہ اِن سیاہ مجسموں کو دیکھا تو ہمارے دل سے ایک آہ نکل گئی .... ہم نے اِن مجسموں کے قدموں تلے پھیلے ہوئے سرسبز لان کو دیکھا جہاں کچھ معصوم بچے بغیر کسی اہتمام کے جشن منا رہے تھے۔ ہم نے اُڑتے ہوئے علامہ اقبال کی یادگار کے طور پر قائم کیئے گئے اس شاہین کے مجسمے کو اشارہ کیا تو وہ بھی ہمارے ساتھ ساتھ اڑنے لگا۔

اب ہم بہت قدیم تاریخی حصّے میں آگئے جہاں پر ایک دو نہیں پورے چار چار مینار ہمیں حسرت سے دیکھ رہے تھے کہ ہم اُنھیں کچھ سنوار دیں اور ہم نے ایسا ہی کیا۔ ہر ایک مینار کو یوں رنگ دیا کہ سب ایک دوسرے سے الگ نظر آنے لگے یعنی ایک مینار سُرخ ' ایک مینار سبز ' ایک مینار زرد اور ایک مینار نیلا .....! "چار مینار" اپنی یکسانیت کی تفریق پر رونے لگا ' ہم نے ان چاروں میناروں کو رخصت ہوتی ہوئی دُلہن کی طرح دلاسہ دیا۔ نئی تہذیب کے نشیب و فراز سمجھا کر ہم نے پھر اُڑان بھری اور جا پڑے صحنِ مسجد میں جہاں کئی کبوتر ڈھیروں دانے کے درمیاں جشن منا رہے تھے۔ ہم نے ادائے بے نیازی سے دوبارہ اُڑان بھری اور چلے قطب شاہی گنبدوں کی طرف وہاں پہنچ کر ہم سوچنے لگے کہ جشن یہاں سے شروع ہونا چاہیئے یا جشن کا یہاں اختتام ہونا چاہیئے .....؟

ہماری سمجھ میں نہ آیا تو ہم چہل قدمی کرنے لگے اور چلتے چلتے قلعہ گولکنڈہ کے پاس آگئے۔ یہاں کے سناٹے میں عبدالرزاق لاری کی ہمیں اچانک چیخ سنائی دی

اور ساتھ ہی توپوں کی گھن گرج بھی ہم کو اپنی کرتب بازیوں پر ہزار ناز سہی لیکن ہم ہیں امن پسند، ہم چیخ و پکار اور ہتھیار کی آوازوں سے بہت دور بھاگنے کے لیے ہی تو جشن منانے چلے تھے کہ ذرا دل بہل جائے گا۔ کچھ دیر ہمارا شہر بھی خوش ہو جائے کہ غیر اہم سمجھا جانے کے باوجود اس کے نام سے جشن تو منایا جا رہا ہے۔ نہ جانے ہم کون سے محل کے کھنڈروں تک پہنچ گئے احساس نہ ہو سکا ہمیں گھوڑوں کی ٹاپوں کی آواز کے ساتھ گھنگرو کی چھن چھن بھی سنائی دینے لگی۔ شائد بھاگ متی کے پازیب نے سرگوشی کی تھی۔ شائد قلی قطب شاہ کے گھوڑے کی ٹاپیں ہم سے ملنے کے لئے قریب آ رہی تھیں۔

ہم نے اس بار کافی لمبی اڑان بھری اور ہم شہر کے پھر قدیم و گنجان علاقے میں اتر پڑے۔ شاہین ہمارے ساتھ ساتھ اڑتے ہوئے نہ جانے کہاں رہ گیا تھا۔ ہم مختلف دشواریوں میں گھرے کھڑے تھے۔ ٹریفک کا نظام درہم برہم تھا، بنڈی ٹھیلے، رکشہ، سیکل، بس اور موٹریں، آٹو رکشہ اسکوٹر اور پیدل راہی سب ایک دوسرے کے ساتھ مل کر گویا جشن منا رہے تھے۔ کوئی جشن کے آداب سے واقف نہ تھا مگر جشن جاری تھا۔

اچانک، ہم لڑکھڑا گئے ایک پتھر سے ٹھوکر کھا گئے، تب ہم نے دیکھا کہ وہ پتھر بڑی شان سے ہمیں مسکرا کر دیکھ رہا تھا۔ ہم نے پوچھا، یہ آپ ہمارے راستے میں کیوں پڑے ہیں؟ تو پتھر نے کہا۔ میں قطب شاہی دور کا پتھر ہوں، لوگ مجھے جشن کے موقع پر بھول گئے ہیں، میں انھیں اپنی یاد اسی طرح دلا دیتا ہوں کہ وہ دوبارہ مجھے بھول

نہ پائیں، میں کسی عمارت میں نصب نہ ہو سکا تو کیا، ہوں تو اُسی قطب شاہی دور کا جب اِس شہر کی "ولادتِ باسعادت" ہوئی تھی، اور "حیدرآباد" اِس کا نام رکھا گیا تھا۔

میں چار سو سالہ قدیم تاریخ کا وہ زبر ہوں جو تاریخ کی "ت" پہ لگتا ہوں اور جشن کی "ج" پر اور شہر کی "ش" پر اور حیدرآباد کی "ح" پر ان تمام شہریوں کے سر کے "س" پر، جسے لوگ صدیوں سے اُٹھائے پھر رہے ہیں .... ـــــ

اچانک ہم نے محسوس کیا کہ ہمارا سر جُھک گیا ہے اور ہم اُڑنے کے قابل نہیں رہے اور یہ سب اِس لئے ہوا کہ جشن کے خواب سے ہم بیدار ہو چکے تھے ....

ـــ ـــ

-۲- -۲- -۲-

"بحرا اُترگیا

ہم قطعاً توہم پرست نہیں بلکہ ہم اِس قدر حقیقت پسند ہیں کہ سب لوگ ہماری "حقیقت" کو ہی سمجھتے ہیں، ہمیں نہیں ....!
ویسے ہم "ناری مخلوق" کے بارے میں اتنا جانتے ہیں کہ اس "ناری مخلوق" کو اللہ نے تاقیامت فتنہ انگیزی کی اجازت دے رکھی ہے اور دنیا والوں نے اس کا نام "بلا" رکھا ہے۔

ہاں! تو ہم کہہ رہے تھے کہ ہم نے اپنی چہیتی و لاڈلی بیٹی کی جان کے صدقے اُتارتے رہنے میں کبھی کوتاہی نہیں کی۔ ہم نے اپنے نام کی طرح "صدقہ" یاد رکھتے ہیں۔ عمر رسیدہ بہت ہی قدامت پسند گھرانے کی خواتین تو ہمارے یہاں آتی رہتی ہیں اُن کے مشوروں پر عمل کرتے ہوئے ہم نے کئی بار اپنی بیٹی کی نظر بھی اُتاری، جس میں چند سفید دھجیوں کو پیلا رنگ لگا کر سر سے پاؤں تک سات مرتبہ اُتار کر جلا دیا جاتا کبھی کیلے، انڈے جیسی واہیات چیزیں بھی رات کو سرہانے رکھ کر صبح صدقے میں دے دیا کرتے۔

اس کے بعد کچھ مشوروں کی فوج ہم پر غالب آنے لگی وہ یہ کہ "جان کا صدقہ جان ہے"۔ ہم نے اپنی جان دینے کی ٹھانی اور تفصیل دریافت کی تو جواب ملا "توبہ، توبہ یہ تو گناہ ہوا، جان کا صدقہ پرندوں، چوپایوں وغیرہ سے دیا

جاتا ہے ...."

ہم نے اُن چڑیوں کو پنجرے سمیت خرید لیا جو نہ جانے کب سے قید تھیں اور اُنہیں بیٹی کے سر پر سے تین دفعہ اُتار کر آزاد کر دیا، اس کے بعد کسی نے کہا کہ کوّا صدقے میں دے دو۔ اب یہ شامت ہماری تھی کہ ہم نے کوّا منگا لیا لیکن اُسے ہاتھ لگانے کی جسارت نہ کر سکے۔ دھڑکتے دل نے ہاتھوں سے طاقت چھین لی، کوّا ہمارے ہاتھ سے نکل گیا اور لگا سارے گھر میں پُھدکنے ....

اور ہم اس کا تعاقب، سی آئی ڈی آفیسر کی طرح کرتے رہے مگر کم بخت جب بھی ہم قریب جاتے تو ایسی بُری آواز نکالتا کہ ہم سارے کے سارے لرزنے لگ جاتے تھے! ملازموں کی مدد سے کوّا پکڑا گیا اور بیٹی کے سر سے اُتارنے کے لئے خادمہ نے ہاتھ اوپر کیا۔ ہماری بیٹی کی "نگاہِ جستجوئے شوق" میں کوّے جیسی چیز کھٹک گئی اور وہ گھبرا کر دور ہٹ گئی۔ ہم نے اُسے زبردستی اپنے بازوؤں میں جکڑ لیا۔ اور اس طرح کوّا بے چارہ مارا گیا۔ اس کے بعد کالی مرغی کا صدقہ لازم سمجھا گیا۔ ہم انڈے ہی نہیں بلکہ مرغ اور مرغی دونوں ہی کھاتے ہیں لیکن ہاتھ لگانا یا پکڑنا وہ بھی زندہ، ہمارے بس کی بات نہیں، مُرغی لائی گئی، کٹخ کٹخ کی آواز سے ہم دہشت زدہ ہونے لگے، ہائے! ہم اب کیسے صدقہ اُتاریں بیٹی کا!! یہ کم بخت تو بہت آوازیں نکال رہی ہے۔ پکڑنا تو ممکن نہ تھا، پھر اُسی بوڑھی خادمہ کی مدد طلب کی گئی جو ایسے کاموں میں ماہر تھی مگر پھر وہی مسئلہ، یعنی "بیٹی کا خوف سے بھاگتا دور ہو کر" ....!

ہم نے پھر لپک کر اپنی بیٹی کو ننھی مُنّی گڑیا کی طرح کلیجے سے لگایا اور اس طرح

صدقہ اُتروا دیا۔ انڈا تو ہم بلا ناغہ شام کو خود ہی اُتار کر پھینکتے ہیں۔ لیکن ہمارے تمام "اُتارے" ہمارے داماد کی نظر میں بے کار رہے۔ وہ اپنے فرہادانہ جذبات سے بھرپور محبت کی تکمیل کے لئے بکرے کا اُتارا اُتارنے پر تُل گئے۔ ہم نے سمجھایا کہ بکرا ہاتھ لگا کر دیتے ہیں، اُتارتے نہیں، مگر محبت کا مارا، عقل سے بھی مارا جاتا ہے نا؟ اس لئے ہمارے قابل داماد کئی کیلو وزنی "بھینس نما بکرا" خرید کر لے آئے جو مسلسل پچھاڑیں کھا رہا تھا اور قابو میں آنے کا نام نہ لیتا تھا لیکن "جوشِ محبت" کے آگے بکرا تو کیا، شیر اور ہاتھی بھی کوئی چیز نہیں۔ ہمارے داماد نے اچانک ٹارزن کی طرح بکرے کو دبوچ لیا اور دونوں ہاتھوں سے اُوپر اُٹھا کر ہماری بیٹی کے سر پر سے سات بار خود ہی وار دیا اور پھر بکرے کے گلے میں رسّی باندھ کر پرانے ملازم کے حوالے کر دی۔

ہماری نازک اندام بیٹی پسینے میں نہا چکی تھی۔ گھبراہٹ کے مارے بُرا حال تھا۔ خیر! یہ سب ہنگامہ آرائی ہم دم سادھے دیکھتے رہے۔ دوسرے دن ملازمہ نے کہا، بی بی! آپ کی بیٹی کی بلا اُتر گئی، صبح تک بکرا اُتر گیا تھا۔

ہم سمجھے نہیں تو کہا، بلا بکرا اُتارنے سے اُتری یا نہیں یہ معلوم ہو جاتا ہے صدقہ کا جانور، وارنے کے بعد بہت ہلکا ہو جائے تو سمجھنا چاہیئے کہ صدقہ اُتر گیا، تب ہماری سمجھ میں بات آئی ..... کہ ..... بکرا اُتر گیا .....! .....!

"ہم نے بھی لڈّو بانٹے"

ہم ہزار جہاندیدہ سہی لیکن بعض معاملات میں بالکل ہی ناتجربہ کار ہیں، ہمیں یہ بات قطعی نہیں معلوم کہ بچوں کی پیدائش کے بعد جب ان کا نام رکھا جاتا ہے تو لڈو کس طرح تقسیم کیے جاتے ہیں۔

خیر! ہماری بیٹی، داماد کو اپنی نومولو بیٹی کے نام کا "اعلانِ عام" کرنے کا شوق ہوا، تو ہم نے کچھ چھوٹی کشتیاں، پھول جو چاندی کے بنے تھے اور اسی طرح کی کچھ چیزیں ان کے سامنے رکھ دیں جو کبھی ہمیں لوگوں نے تحفتاً بھیجے تھے۔ بیٹی داماد کو وہ سب چیزیں پرانی لگیں۔ انھوں نے نئے طریقہ سے بچی کے نام کے کارڈ چھپوائے۔ ہم نے اپنے بڑے ہونے کا ثبوت پیش کرنے کے لئے لڈّو کا انتظام اپنے ذمہ لے لیا۔ ہم ایک جنرل اسٹور پر گئے۔ دوکان دار سے کہا کہ "لڈو تقسیم کرنا ہے، ہمیں لڈّو چاہیئے"۔ جی بہت اچھا! کہہ کر دوکان دار نے ایک بڑا سا بند تھیلا ہمارے حوالے کیا اور ہم اپنی بزرگی پر فخر کرتے ہوئے گھر لے آئے۔ تھیلا کھولا، لڈو نکالے..... بدچاکلیٹ کے رنگ کے لڈّو پر موتی جیسی سفید تِل لگی تھی۔ ہم نے تھالی میں لڈو اور نام کا کارڈ رکھا اور اس چھوٹی سی تھالی پر زرین جالی کا کپڑا جسے گوٹا لگا تھا باندھ کر تقسیم کروا دیئے۔ جب گھر والوں کے لڈو کھانے کا وقت آیا تو لڈّو شائد خفا ہو گئے تھے۔ اتنے سخت

کر توڑنا محال ہوگیا، لڈو کیا تھے، اچھے خاصے "کرکٹ بال" تھے۔ خیر ہاون دستے کی مدد سے ٹکڑے کرتے گئے اور شکلیں بنا بنا کر کھاتے گئے۔

ہمارا شمار بزرگوں میں ہوگیا تھا، ہم لڈو چبانے کی آواز کو اونچا نہیں ہونے دے رہے تھے۔ ایک بڑا سا ٹکڑا منہ میں رکھا اور چوسنے لگے، کئی گھنٹے تک تحقیق سی مٹھاس کا احساس رہا۔ جب لنچ سے ڈنر کا وقت آیا تو ہم نے وہ ٹکڑے منہ سے نکال پھینکا......!

خیر! دوسرے دن ہمارے دروازے پر کچھ دھاچوکڑی کے ساتھ ستم گر سی دستک سنائی دی۔ ہم نے دروازہ کھولا .... ایک صاحبہ اپنا چوکرا اور لڈو ہاتھ میں لئے ہم پر اپنا غصہ نکالنے لگیں۔ دوسری طرف دو تو ایک صاحب (جو ہمارے عزیز بھی تھے) جن کے منہ سے خون ٹپک رہا تھا۔ ایک ہاتھ میں لڈو اور دوسرے میں دو دانت لئے کھڑے تھے۔ تیسری طرف ہم نے دیکھنے کی ہمت نہیں کی اور دروازے پر لگی "ان۔ آوٹ" کی پلیٹ کو دیکھا پھر "آوٹ" کو "آوٹ"، "ان" کو "ان" کرتے ہوئے ہم نے کینگرو کے بچے کی طرح گردن دروازے کے اندر کر لی اور دروازہ اتنی زور سے بند کیا کہ ہمارے منہ سے دوسرا لڈو کا ٹکڑا ایک "کھنک" کے ساتھ ٹوٹ گیا۔ ہم نے مارے غصے کے لڈو تھوکا لیکن لڈو کے ساتھ دانت بیچارہ بھی باہر آگیا، اس طرح ہماری بزرگی بھی مستند ہوگئی۔

جن لوگوں نے لڈو کھائے ان سب کا حال ہم بتانے سے قاصر ہیں لیکن سچ یہ ہے کہ ان لڈوؤں کی تقسیم کے بعد بہت سے لوگوں نے ہم سے ملنا چھوڑ دیا ہے شاید اس ڈر سے کہ ہم نے اگر دوبارہ لڈو کی تقسیم شروع کردی تو کیا ہوگا......؟

==

"سیاست"

معزز قارئین! آپ سمجھ رہے ہوں گے کہ ہم موجودہ سیاست کے میدان میں، ہجومِ بیکراں کے سمندر میں کس طرح گھس پٹ کر "الیکشن" کے پھانسی نما تختے پر کھڑے ہونا چاہتے ہیں۔ جی نہیں، ہرگز نہیں! کبھی نہیں! اللہ نہ کرے کہ کبھی ہم سے ایسی بھیانک غلطی ہو، ہم "بلدی اُمور" بھی اپنے گھر میں انجام دیتے دیتے تھک چکے ہیں۔ ہم فطرتاً ہی نہیں واقعتاً معمولی سے امن پسند شہری ثابت ہوئے ہیں۔

ہاں! تو ہم نے "سیاست" کے بارے میں جو لکھا ہے وہ دراصل ملک کی سیاست نہیں بلکہ "اخبارِ سیاست" کے بارے میں ہے۔ جی ہاں! روزنامہ "سیاست" کے بارے میں جن کے ایڈیٹر محترم عابد علی خاں صاحب اور جوائنٹ ایڈیٹر محترم محبوب حسین جگر صاحب ہیں۔ عالمی شہرت یافتہ سیاست اخبار کے ان بانی صاحبین کے بارے میں ساری دنیا جانتی ہے۔ مجھ ناچیز کو ان بزرگانِ علم وادب کے بارے میں کہنے کی ضرورت ہی کیا ہے؟ ہاں! تو بات ہے سیاست اخبار کی۔ صبح کے وقت ہمارے بند دروازے کی دراز میں سے یکے بعد دیگرے کئی اخبارات، اخبار والا سرکا جاتا ہے اور ہم اُس اخبار کے گٹھے پر جھپٹ پڑتے ہیں، جن میں کئی انگریزی اور اُردو اخبار ہوتے ہیں اور چُن کر ہم "سیاست"

لے لیتے ہیں اور بڑے ٹھاٹ سے بیٹھ کر سرسری نظریں دوڑاتے ہیں۔ ہم ہمیشہ "سیاست" اُلٹ کر دیکھتے ہیں، یعنی آخری صفحہ سے ابتداء کرتے ہیں اور پہلے پر انتہا، نہ جانے کیوں، ہمیں ایسی عادت ہے۔ اکثر ہم بے چین کرنے والی خبروں پر نظر پڑتے ہی بے خیالی میں اُٹھ کر ٹہلنے لگ جاتے ہیں اور ٹہلتے ٹہلتے ہی اخبار کا مطالعہ کرتے جاتے ہیں۔ ہم پڑھنے اور ٹہلنے میں اتنے منہمک ہو جاتے ہیں کہ ہمیں "سیاست" سے آگے کچھ نظر ہی نہیں آتا، نتیجتاً ہاتھ میں چائے کا کپ لے کر ہماری طرف آتی ہوئی خادمہ سے ٹکرا جاتے ہیں۔ چائے کا کپ اُلٹ جاتا ہے، ہم اپنے "سیاست" کو صاف بچا لیتے ہیں اور گرم چائے کی زد میں خود کو کر لیتے ہیں۔ گرم چائے سے جھلسنے کے باوجود ہم "سیاست" کی طرف ہی متوجہ رہ کر دل ٹھنڈا کرتے رہتے ہیں۔ کہیں کہیں "اختلاج قلب" میں مبتلا کرنے والی خبروں سے بیزار ہو کر ہم "فکر و خیال" کا شعر پڑھ لیتے ہیں کیونکہ ہم کو یہ ایک شعر بھی ایک دیوان کی طرح لگتا ہے۔ سازگار و ناسازگار حالات سے مطابقت رکھتے ہوئے جو شعروں کا انتخاب ہوتا ہے وہ ہمیں بے حد پسند ہے اور ہم اُس شعر کو یوں یاد کر لیتے ہیں جیسے کہ وہ شعر ہمارا ہی ہو . . . . .

ہم مطالعہ اور چہل قدمی جاری رکھتے ہوئے اسکول و کالج جانے کیلئے تیار ہونے والے اپنے بچوں سے بھی ٹکراتے رہتے ہیں جو اپنی تیاریوں میں مصروف ادھر سے اُدھر آتے جاتے رہتے ہیں، ہم سے ٹکراؤ کے بعد ہمارے بچے ہم کو زبردستی صوفے پر بٹھا دیتے ہیں۔ اب ہمارے بازو خادمہ دوسری چائے کی پیالی لاکر رکھ دیتی ہے اور اصرار کرتی ہے کہ پہلے ہم چائے پی لیں۔ ہمیں یہ "مداخلت بیجا"

سہتے ہوئے خوش اخلاقی سے کہنا پڑتا ہے کہ "شیشہ و تیشہ" کے بعد، خادمہ
پوچھتی ہے، کیا؟ کون سا شیشہ؟ اور نہ جانے کیا سوال ہوتا ہے کہ ہم سر
ہلا دیتے ہیں۔ ایک بار اسی طرح خادمہ نے ہم کو شیشہ یعنی "ٹماٹو ساس کا شیشہ"
صبح صبح ہمارے ہاتھ میں تھما دیا۔ ہم حیران ہوئے تو انہوں نے کہا "آپ ہی نے تو
کہا تھا شیشہ لانے کو!" ہم جھنجھلا کر ڈانٹنے لگتے ہیں، نہ جانے کیا کہتے ہیں کہ
دوسرا گھی کا شیشہ ہمارے سامنے رکھ دیا جاتا ہے اور ساتھ شہد کا بھی، اور پھر
"سرکہ" کا بھی ...... اللہ، اب ہم کیا کریں ....؟ ہم جب خادمہ کو ڈانٹنے
لگے تو اس نے قسم کھا کر کہا کہ ہم نے ہی اسے شیشے لانے کو کہا تھا۔ ہمیں خیال
ہی نہیں کہ ہم نے کیا کہا تھا، شائد "شیشہ و تیشہ" دیکھتے دیکھتے منہ سے کچھ
نکل گیا ہو اور نتیجتاً ہم اپنے اطراف شیشوں میں سجے بیٹھے رہ گئے۔

"سیاست" میں جب کبھی ہم انڈوں کے دام کم دیکھتے ہیں تو فوراً ملازمہ
کو دوڑا کر اسٹاک کروا لیتے ہیں کیونکہ انڈے ہمارے کئی مسائل حل کرتے ہیں،
ٹماٹوں کے کٹ میں، تو کبھی کٹلٹ پر، کبھی پلاؤ میں، تو کبھی سینڈوچ کے لئے
کہیں لوز کی شکل میں تو کبھی پڈنگ کی ڈش میں، کبھی کیک کے سانچوں میں، تو
کبھی فرائی پین میں، کبھی آملیٹ تو کبھی اُبلے ہوئے، ہمارے یہاں انڈوں کا
بہت خرچ ہے۔ بچوں نے ہینڈ ورک میں بھی انڈوں کے چھلکوں کی سخت ضرورت پیش
آتی ہے مگر اس کے لئے خاص انداز سے انڈے توڑنا پڑتا ہے خیر! تو ہم "سیاست"
کی مدد سے کچھ بچا لیتے ہیں۔ ہم عام طور پر ٹی وی نہیں دیکھتے ہاں! ٹی وی کا وہ
پروگرام ضرور دیکھتے ہیں جو "سیاست" میں لکھا ہوتا ہے۔ اگر مطلب کا ہو تو

کبھی کبھار ٹی۔ وی کے آگے بیٹھ گئے ورنہ نہیں۔ "سیاست" سے ہی ہمیں معلوم ہوتا ہے کہ آج دن کیا ہے؟ تاریخ کیا ہے، ورنہ ہمیں تو "مصروفیات" نے اس قدر مصروف رکھا ہے کہ ہم کو کچھ خبر نہیں ہوتی کہ کب شام ہوتی اور کب صبح ہوئی۔ ارے نہیں، یہ تو ہم ذرا روانی میں بول گئے، صبح کب ہوتی ہے ہمیں اچھی طرح خبر ہوتی ہے، صبح تب ہوتی ہے جب "سیاست اخبار" آتا ہے ...... ہم نے سچ کہا نا ......؟

ایک بات بتانا ہم بھول گئے وہ یہ کہ اتوار کے دن لوگ دیر سے اُٹھتے ہیں لیکن ہم اتوار کے دن بہت سویرے اُٹھ جاتے ہیں۔ اتوار کا "سیاست" ہمیں "جانِ عزیز" سے کم نہیں لگتا، ہے نا؟ آپ سمجھ رہے ہوں گے کہ ہم نے "ہے نا" پر اپنا مضمون ختم کر دیا، جی نہیں ایسی خوش فہمی میں نہ رہئے ابھی چند قدم اور آپ کو ہمارے اس تحریری سفر میں ساتھ چلنا ہے، کچھ عرصہ سے ہمارے مضامین "سیاست" میں شائع ہونے لگے ہیں۔ یہ "بزرگانِ علم و ادب" کی مہربانی ہے۔ ہمیں بھی دوسروں کے سر درد کی پرواہ نہ کرتے ہوئے اپنی کچھ سنانے کا موقع مل جاتا ہے اور اس طرح ہم بھی "اہلِ سیاست" ہو گئے ہیں۔ "سیاست" میں ہمارے لئے سب سے زیادہ جو اہم بات نظر آتی ہے وہ "خواتین کا کالم" ہے۔ خواتین یوں بھی بڑی باصلاحیت ہوتی ہیں۔ اس لئے تو علامہ اقبالؔ نے کہا ہے کہ ؎

وجودِ زن سے ہے تصویرِ کائنات میں رنگ

یہ کسی کو کائنات میں رنگ نظر آئے نہ آئے لیکن "سیاست اخبار" نے اس

شعر سے تعاون کرتے ہوئے باقاعدہ ایک کالم خواتین کے لئے محفوظ کردیا ہے اور لکھنے والی سبھی خواتین کی معیاری تحریروں سے ہم بھی مسلسل متاثر ہوتے رہتے ہیں۔ ویسے ہماری بھی بہت حوصلہ افزائی کی جاتی ہے۔ اب یہی دیکھئے نا' کہ ہماری بے ربط سی تحریریں بھی سیاست کی زینت بنائی جاتی ہیں، ہم نے تو سیاست کے مطالعہ کے بعد ہی لکھنے کی مشق شروع کردی تھی اور سیاست میں اپنی کسی تحریر کو چھپا ہوا دیکھنے کی خواہش گویا ہماری "آخری خواہش" تھی۔ آخر "اخبارِ سیاست" کی مالک و مہربان ہستیوں نے بڑے خلوص کے ساتھ ہماری خواہش کا احترام کرتے ہوئے ہماری تخلیقات کو شاملِ اشاعت کر ہی لیا۔ اِس خلوص و تعاون کے ہم ہمیشہ ہی شکر گذار رہیں گے۔ ہم جب اپنا کوئی مضمون یا غزل سیاست میں دیکھتے ہیں تو ہماری خوشی بے ٹھکانہ ہوجاتی ہے اور اُس دن کے اخبار کو خاص طور پر ہم اپنے کباڑ خانے جیسی الماری میں "نوادرات" کی طرح محفوظ کرلیتے ہیں۔ ہم اُسے "سیاست اخبار" نہیں بلکہ "اہلِ سیاست" کی جانب سے دیا گیا' اعزاز سمجھتے ہیں اور یہی حقیقت بھی تو ہے ...... ہے نا — !!!

--

دورِ ترقی اور ہم

ترقی کا تریاق بے اثر ہو کر احساس و فکر کا زہر ہم میں سرایت کر چکا ہے۔
بات یہ ہے کہ ہم جس کو ترقی سمجھ رہے ہیں اُس سے ہمارے عرصۂ حیات میں کمی
ہوتی جا رہی ہے ۔ ۔ ۔ ۔ ! انسان کے آرام کے لئے ضرورت سے زیادہ ایجادات
ہو چکی ہیں۔ اِس مشینی دور میں انسان بھی مشین بن گیا ہے۔ ہم ترقی کی چند
گھریلو مثالیں پیش کرنے جا رہے ہیں، جس سے یقیناً آپ بھی متفق ہوں گے۔
دیکھئے ۔ ۔ ! ٹیلی فون ایجاد ہوا۔ یہ ترقی ہی تو ہے نا؟ آدمی جب
چاہے، جس سے چاہے، جتنی دیر چاہے باتیں کر سکتا ہے۔ خط آدھی ملاقات
کبھی ہوا کرتا تھا مگر اب ٹیلیفون تین حصّے ملاقات کا سبب ہے۔ بہت سے کام
ٹیلی فون سے بنتے اور بگڑتے آ رہے ہیں۔ زندگی میں ٹی۔ وی بھی ضروری ہے۔
دل بہلائی کا سامان گھر پر ہی ہو جاتا ہے، خبریں سُنی جاتی ہیں، ملک کے اندر
اندر باہر کی فضا چھائی جاتی ہے، مطلب یہ کہ ترقی کا دوسرا ثبوت ۔ ۔ ۔ ۔ ۔
تیسرا ثبوت ہے ریفریجریٹر، اس میں سب کچھ اسٹور رہتا ہے، گوشت، ترکاری،
دوائیں، پھل، ٹھنڈا پانی، برف، ہفتہ میں ایک دن پکوان اور پھر بیٹھ کر کھانا
ہی ہوتا ہے نا! اسٹار ٹی وی نے تو مصروفیات میں چار چاند لگا دیئے ہیں۔
ہر وقت تازہ پکا ہوا کھانے کے بجائے لوگ باسی کھانے کے عادی ہو گئے ہیں۔

چوتھی ترقی ہے ایرکنڈیشنڈ یا ایرکولر موسم گرما کو ندامت کے سوا دیتا ملتا کیا ہے؟ سرپٹک کر آگ بگولہ ہو کر چلا جاتا ہے۔ ہم گھر کے ماحول کو ٹھنڈا کر کے لطف اندوز ہوتے رہتے ہیں۔ استری، بجلی کے پنکھے، مسالے پیسنے کی مشین، ٹرانسسٹرز وغیرہ تو پرانے زمانے کی باتیں ہیں۔ کپڑے دھونے کی مشین نے "خاتون خانہ" کو وہ آرام دیا ہے کہ آج تک کسی خادم نے نہیں دیا۔ دھوبن یا دھوبی کے بغیر کپڑے دھل جاتے ہیں۔

آج کل کمپیوٹر کی حکمرانی ہے۔ حسابات میں غلطیاں عام ہیں۔ انسان جو کمپیوٹر کا موجد ہے وہ کبھی بیچ بولنے پر قائم نہیں رہ سکا، تو بھلا انسان کی "ایجاد" کیسے ہمیشہ سچ کہہ سکے گی۔ کمپیوٹر سے کئی پریشانیوں کا سامنا ہے۔ مثلاً ایرلائینس کے آفس میں نام کی غلطی، بنک اکاؤنٹ میں حساب کی غلطی، ایکسرے ٹسٹ میں غلطی، بلڈ گروپ بھی غلطی کا شکار، اس لئے ڈاکٹر بھی غلطی کا شکار......!

ایک مہینہ آرام اور ٹھاٹ سے گذار کر ہم کو احساس ہوتا ہے کہ واقعی زندگی بڑی پرلطف ہے لیکن جب بجلی کا بل، ٹیلیفون کا بل، اسٹار ٹی وی کا بل ہاتھ میں آتا ہے تو آہ بھی نہیں نکلتی، سمجھ میں آتا ہی نہیں کہ آخر اتنا بل کیسے آیا؟ ضرور کوئی گڑبڑ ہے، ہزاروں کا بل ادا کر کے ہم بیمار ہو جاتے ہیں فکر لمحہ لمحہ احساس دلاتی ہے کہ پورا مہینہ پڑا ہے، باقی اخراجات کیسے پورے ہوں گے؟

ترقی تو صرف سامانوں کی حد تک ہوئی ہے، ترقی نے ایسا کوئی مشین

نہیں بنائی جو دولت کی بارش کر سکے۔ فرض کیجئے دولت کی بارش ہو بھی جائے تو یقیناً بلوں میں مزید اضافہ ہوگا۔ دولت کے "اسٹور روم" کا کرایہ یا "میٹر" تو ہوگا نا......؟

ہمیں اکثر یہ خیال آتا ہے کیوں نہ ہم اُس پرانے دور میں اُلٹے پاؤں لوٹ جائیں جہاں گاڑی، پٹرول جیسی مہنگی چیزوں کا تصور بھی نہیں تھا۔ ہاتھ کے رکشا کے بعد سیکل رکشا یا پھر دور تک پیدل چلنے میں بھی "شان" ہوا کرتی تھی (پالکی کا دور ہم نے دیکھا نہیں)۔

بجلی کا بل لمبی سی قطار میں ٹھہر کر جب ہم گھر لوٹتے ہیں تو سارے بدن میں "ملیریا" جیسی کیفیت محسوس ہونے لگتی ہے، ہم لیموں کا رس پی کر سو جاتے ہیں اور ملاٹل جاتی ہے۔ ٹیلیفون کے بل کی ادائی اتنی دیر میں ہوتی ہے کہ کئی بار ہم بیہوش ہو کر گر چکے ہیں اور آس پاس کے لوگوں نے ہمارے منہ پر پانی کے چھینٹے مار کر ہوش دلایا ہے۔

ہزاروں روپے کا بل ٹیلی فون آفس میں بھر چکنے کے بعد ہم میں اتنی سکت باقی ہی نہیں رہتی کہ ہم کچھ ناشتہ کرلیں، ہم ٹیلیفون کے تاروں کی طرح اُلجھے اُلجھے گھر پہنچتے ہیں اور بستر پر یوں دراز ہو جاتے ہیں جیسے کبھی نہ اُٹھنے کی قسم کھا چکے ہوں۔ لیکن ٹیلی فون کی مدھر گھنٹی سُن کر ہم لپک کر ریسیور اُٹھا لیتے ہیں اور اپنے کسی ہمنوا کے آگے ٹیلی فون بل کا رونا روتے روتے غیر ارادی طور پر ہنس پڑتے ہیں اور بڑی خوش اخلاقی سے اپنے "ہم کلام" سے کہتے ہیں۔

"خیر! کوئی بات نہیں آپ سے گفتگو ہو جاتی ہے، یہ بڑی بات ہے۔ بلوں کا

کیا ہے وہ تو آتے ہی رہتے ہیں" ..... وغیرہ ..... وغیرہ ..... !
بات ختم ہوتے ہی ہماری " خودکار انگلیاں " کسی دوست کا نمبر ڈائل کردیتی ہیں اور ہم پھر سے محو کلام ہوجاتے ہیں۔ آنے والے دنوں کے نئے بل کا خوف ہمارے دل سے نکل جاتا ہے اور ہم نمبر پر نمبر ملاتے جاتے ہیں اور گھنٹوں باتیں کرتے جاتے ہیں۔ اس دورِ ترقی نے ہمیں خوب بولنا سکھایا ہے۔ ہمارا خیال ہے کہ ہم لیڈروں کی طرح گھنٹوں نہ صرف بول سکتے ہیں بلکہ بولنا سکھا بھی سکتے ہیں۔

ہم بہت سارے مسائل سے دوچار رہتے ہیں۔ اس لئے اکثر ڈاکٹروں سے مستقل رابطہ رہتا ہے۔ ہم اپنے "پل پل" کی خبر اپنے فیملی ڈاکٹر کو دیتے اور مشورہ لیتے رہتے ہیں مثلاً جب ہم کہتے ہیں ڈاکٹر صاحب ! ہماری نبض ایک سو فی منٹ چل رہی ہے تو ڈاکٹر صاحب کہتے ہیں کہ ضرور کوئی صدمہ ہوا ہوگا یا پھر آپ نے ٹیلی فون کا بل ادا کیا ہوگا، ہم اپنے فیملی ڈاکٹر کے مزید معتقد ہوجاتے ہیں۔

کبھی ہم بتاتے ہیں ڈاکٹر صاحب ! ہماری نبض ساٹھ چل رہی ہے تو ڈاکٹر صاحب کہتے ہیں آرام کیجئے، ضرور آپ کچھ سوچ رہے ہونگے یا آنے والے بجلی کے بل کا خیال آرہا ہوگا، اور ہم اپنے فیملی ڈاکٹر کی اس "الہامی صفت" کے اتنے قائل ہوجاتے ہیں کہ ہمیں اس "دورِ ترقی" پر ذرا دیر کے لئے رشک آہی جاتا ہے۔
احساس میں سرایت کرجانے والے زہر کا اظہار ابھی تک ہم نے ڈاکٹر سے نہیں کیا وہ اس لئے کہ ترقی کا کوئی تجربہ ہم پر نہ ہوجائے ......!
تجربات کی ترقی ہمیں بھی "ترقی کی منزل" تک وقت سے پہلے نہ پہنچادے ہے نا!

==

"ہم اور ہمارے وہ"

یہ جو ہمارے "وہ" ہیں نا! بڑے "وہ" ہیں۔ ان کو کب غصہ آجائے گا کب یہ سنجیدہ ہوں گے۔ یہ کب خوش ہوں گے اور کب رنجیدہ ہو جائیں گے اس کا اندازہ ہمیں آج تک نہ ہو سکا۔ ہم نے کئی بار ان کے مزاج کے بھنور میں غوطہ لگائے، کئی بار ڈوبتے ابھرتے رہے مگر ان کی ذات کی گہرائی تک ہم نہیں پہنچ سکے۔ یہ اکثر وقتی طور پر جذبات کی لہر سے گردشِ دوراں کی تہہ تک پہنچ جاتے ہیں تو کبھی حوصلے کے ساحل پر منجمد ہو جاتے ہیں۔ ان کے ڈوبنے ابھرنے سے ہوتا تو کچھ نہیں لیکن ہم احساسِ کمتری کے آبشاروں میں بہہ نکلتے ہیں۔ ہمیں شرف حاصل ہے ان کے رفیقِ حیات ہونے کا، مگر ان کی حیات کا انداز دوڑنے والا سا ہے۔ ہم اپنی شکستہ پائی کے باوجود ان کے ساتھ دوڑ لگاتے رہتے ہیں۔ ہمارے "زخم پا" کبھی مندمل نہیں ہو پاتے۔

"وہ" مشرق کی جانب چلتے چلتے اچانک رُخ بدل کر مغرب کی طرف دوڑنے لگتے ہیں۔ جیسے سہ پہر کے بعد آفتاب جانبِ مغرب تیزگام ہو جاتا ہے، دیکھئے تو ذرا ان کی عادتیں جو ہمارے لئے سوہانِ روح بن جاتی ہیں اور کبھی دودھ اور شہد کی نہروں والی جنت میں سکونت کا گمان ہونے لگتا ہے۔ یہ عام آدمیوں کی طرح ہماری تعریف نہیں کرتے یہ ہمیں دنیا سے ہی نہیں خود اپنی بھی نظر سے چھپا رکھنا چاہتے ہیں۔ ہمارا کوئی بھی پکوان ان کے پسند کے قابل نہیں ہوتا۔ جب کبھی ایسا اتفاق ہو تو ہم [illegible] کی طرف بڑھا

اُمید سے دیکھتے ہیں کہ شاید پہلے "لقمۂ لذیذ" پر آج تو داد مل جائے گی مگر وائے ناکامی! یہ چپ چاپ پیٹ بھرنے کے بعد دستر خوان سے اُٹھ جاتے ہیں۔ اگر کبھی کسی "ڈش" میں مرچ زیادہ یا میٹھے میں شکر زیادہ ہو تو پہلے ان کی بھنویں چڑھ جاتی ہیں۔ بعد میں یوں اظہار ہوتا ہے۔ "ہمیشہ ایسا پکوان تو نہیں ہوتا تھا، اب کیا بات ہو گئی ہے؟" لیجئے صاحب ہم نے چور پکڑ لیا۔ ہم پر ہونے والی تنقید میں ہماری تعریف ہم نے ڈھونڈ لی۔ "پہلے نہیں ہوتا تھا" کا مطلب یہی ہوتا ہے کہ ہم اچھا پکوان کرتے ہیں۔

مگر زبان سے اعتراف کرنے میں وہ ہمیشہ پس و پیش کرتے رہے ہیں کہ کہیں ہمارا دماغ خراب نہ ہو جائے۔

"وہ" ہمارے لئے بہترین ساڑیاں لاتے ہیں۔ خوب سے خوب تر کا انتخاب ان کی نظر میں ہمیشہ رہتا ہے۔ ہمارے پہننے کے بعد بے چارے اپنی لائی ہوئی ساڑیوں کے بارے میں تعریفوں کے پُل باندھنے میں لگ جاتے ہیں اور ہمارے بارے میں ایک لفظ بھی نہیں کہتے۔ وہ نہیں چاہتے کہ ہم ان کی نظر کا شکار ہو جائیں اور درد شکم سے تڑپنے لگیں۔ بس ایک ہی گہری نظر میں وہ ہمارے سراپے کا جائزہ لے کر مطمئن ہو جاتے ہیں۔ دوبارہ کی زحمت وہ کبھی نہیں گوارا کرتے ہاں! اگر ہم سے کوئی غلطی سرزد ہو تو اچھی طرح خبر لیتے ہیں۔ مثلاً اگر ہم بار بار ایک ہی ساڑی پہن کر کہیں جانے اور آنے لگیں تو کہتے ہیں۔ "کیا تمہارے پاس ایک ہی ساڑی ہے؟ کیا الماریاں ہراج کرنے کا ارادہ ہے . . . . ." وغیرہ وغیرہ۔

وہ ہمارے لئے ساڑیوں کا انتخاب بہت ہی محبت سے کرتے ہیں۔ انتہائی خوش رنگ، بڑے ہی جاندار پرنٹ ہمارے لئے خرید لاتے ہیں۔

کبھی کبھی اگر ہم اپنی پسند سے کوئی بالکل سادہ ساڑی خرید لیں اور پہن کر کہیں جانے لگیں تو ارشاد ہوتا ہے کہ کیا یہ ساڑی نانی ماں کی ہے ؟ یا دادی ماں کی ساڑی تم نے تبرکاً پہن لی ہے۔"؟

ہم منہ پھلائے ہوئے کپڑے بدل لیتے ہیں اور دل میں سوچتے ہیں کہ ہم خود ہمارے نہیں رہے ۔۔۔۔۔۔

چلئے! اب ہم چلتے ہیں، ہمارے وہ ہمارے ساتھ شاپنگ کے لئے تیار کھڑے ہیں اور ہم ان کی لائی ہوئی جھم جھماتی شوخ رنگ ساڑی پہن کر جا رہے ہیں۔۔

!۔۔۔۔۔

۔۵۔ ۔۵۔ ۔۵۔

"آج کل"

خدا معلوم آج کل ہمیں کیا ہوگیا ہے جو ہم "اُلٹی گنگا" بہانے پر تُلے ہیں
آج کل ہم اخبار اُلٹی طرف سے پڑھنے لگے ہیں یعنی کہ آخری صفحے سے شروع کر کے
پہلے صفحے پر ختم کرتے ہیں۔ اگر ہمارے بس میں ہوتا تو ہم دنیا کا نقشہ بھی اُلٹ
دیتے اور چاند تارے واقعی قدموں تلے ہوتے لیکن زمین میں دھنسے ہوئے پہاڑ بھی ہم
پر ٹوٹ پڑتے۔ فی الحال اس پروگرام کو ملتوی سمجھئے۔

ہم اپنے آپ میں کچھ عرصہ سے ایسی تبدیلی محسوس کر رہے ہیں جو بیان سے باہر
ہے۔ بات دراصل یہ ہے کہ خبریں ہماری نظروں سے نہیں گذرتیں بلکہ نظریں خبروں پر سے
گذری جارہی ہیں۔ نتیجتاً ہم غلط سلط پڑھنے لگ گئے ہیں۔ مثلاً "فلاں ولد فلاں کا
انتقال" ہم ولد کے بجائے "اور" پڑھ کر دل میں افسوس کرنے لگتے ہیں کہ ایک ہی گھر
میں دو، دو افراد وفات پا گئے اور بھرے دل سے دعائے مغفرت بھی کر دیتے ہیں۔
کہیں "اکتوبر" لکھا ہوا ہو تو ہمیں "کبوتر" نظر آتا ہے۔ مثلاً کبوتر میں برساتی میلہ"
ہم یہ سوچتے ہیں کہ شائد بڑا سا کبوتر نما کوئی ہال بنا کر اُس میں مصنوعی بارش سے میلہ
لگایا جائے گا" اور لوگ بھیگ کر بلّی بن جائیں گے ۔ ۔ ۔ ۔ !

ہمیں اعتراف ہے کہ ہماری ان غلطیوں کا سبب ہماری عجلت پسندی ہے۔
وہ یوں ہے کہ ہمارے پاس روز صبح اُردو اور انگریزی اخبارات کا ایک بنڈل آتا ہے

جیسے ہم سب سے پہلے پڑھنا چاہتے ہیں، اس سے پہلے کہ ہمارے لئے کسی دوست کا کوئی معلوماتی فون آجائے، ہم پہلے جیت جانا چاہتے ہیں۔ کبھی کبھی ہم اپنے تتنا سا چہرے بھی اخبار میں دیکھ کر زبردستی پڑوسیوں کو بھی دکھاتے ہیں۔

جلوسوں کی خبر تو ہمیں سب سے پہلے پڑھنا ہوتی ہے کیونکہ یہ خبر ہمارے لئے بہت اہم ہوتی ہے۔ ہمارے باہر جانے کا پروگرام جلوسوں پر ہی منحصر ہوتا ہے۔ جب جلوس نہ ہو تو ہم گھر سے باہر نکلنے کی جسارت کرتے ہیں ورنہ ہمیں تو ہمارا گھر ہی محفوظ لگتا ہے ہاں، تو ہم کہہ رہے تھے کہ ہم نے اپنا انداز مطالعہ بدل ڈالا ہے۔ کئی مضامین کے "بقیہ سلسلے" اور ابتدائی صفحات بعد میں پڑھتے ہیں۔

ہم اخبار پڑھنے کے عادی ہونے کے باوجود "دن اور تاریخ" نہیں جانتے کیونکہ "دن اور تاریخ" پڑھتے تک دوسری تاریخ آجاتی ہے اور دوسرا دن نکل آتا ہے۔ اب بھلا پرانی باتوں کو کیا یاد کرنا . . . . اخبارات سے ہماری دوستی پرانی ہے لیکن مطالعہ ہم نئے انداز میں کرنے لگے ہیں جس سے کافی مشکلات پیدا ہوگئی ہیں۔ ہمیں اکثر شرمندگی کا سامنا کرنا پڑتا ہے۔ جب ہم غلط خبریں پڑھ کر گھر والوں کو سناتے ہیں اور بڑوں سے "ڈانٹ" اور چھوٹوں سے "مات" کھا جاتے ہیں۔ ہمارے سرتاج ہمیں سمجھاتے سمجھاتے تنگ آچکے ہیں، مگر اب تک ہم میں تبدیلی ذرا بھی نہیں ہو سکی۔

خدا کا شکر ہے کہ ابھی ہم سطروں کو اوپر سے نیچے دیکھ رہے ہیں۔ اگر سطریں نیچے سے اوپر دیکھنے لگیں، تو دنیا کا تو نہیں لیکن ہمارا نقشہ یقیناً بدل جائے گا۔

اس کے باوجود ہم ایک غلطی کبھی نہیں کرتے ، ہرگز نہیں کرتے
وہ یہ کہ اخبار کبھی کسی کو پہلے نہیں پڑھنے دیتے ، ہمارے بعد اُلٹا سیدھا
ہم سے پہلے کچھ بھی نہیں ، ہرگز نہیں ....!
مگر آپ لوگ ہماری نقل کرنے کی کوشش نہ کیجیے کہ اس میں
جغرافیائی غلطیوں کا اندیشہ ہے ، ہے نا ؟ --

اخبار اور ہم

نکسلائٹ ، بم ، دھماکہ ، اغواء ، کانفرنس ، ڈاکہ ، سرقہ اور.....
.....اور بھی بہت کچھ ....

اس طرح کی خبریں ہم روزآنہ اخبار میں دیکھتے دیکھتے جب حد سے
زیادہ تنگ آ گئے تو ہم نے اخبار کی سُرخیاں بھی دیکھنی چھوڑ دیں، لیکن
چونکہ ہم اخبار دیکھنے کے عادی ہیں اور یہ عادت ہمیں نہ صرف ورثے میں ملی ہے
بلکہ ہمارے "شوہرِ نامدار" کے خاندان میں بھی یہ سلسلہ جاری ہے۔ اس لئے یہ عادت
چھٹتی نہیں ہے ظالم .... کے مطابق ہماری سانسوں سے بندھی ہے، صبح جب
ہم اپنی بالکنی سے باہر منہ کر کے صبح تازہ ہوا میں لمبی لمبی سانسیں لیتے ہیں اس وقت
ہمیں اخبار کی یاد آجاتی ہے اور ہم اپنی سانسیں لینا بھول کر پوری طرح بلکہ عملاً
اس یاد کی طرف متوجہ ہو جاتے ہیں اور یہ کم بخت یاد اکیلی نہیں آتی، اپنے ساتھ
ایک اور یاد لے آتی ہے وہ ہے "چائے کی یاد" صبح کی اولین ساعتیں ہم حسب
حیثیت عبادت کے بعد اخبار اور چائے سے شروع کرتے ہیں۔ اب چونکہ اخبار کی
سُرخیاں دیکھتے ہی اختلاج ہونے لگا ہے، اس لئے ہم نے اپنی نگاہیں
سُرخیوں سے پھیر لیں اور ہم دوسری طرح کی خبریں پڑھنے لگے ہیں۔ مثال کے طور پر
"انڈوں کا نرخ" "انڈوں کی قیمت فروخت" پھر چلر قیمت فروخت فی انڈا ۸۰ پیسے

وغیرہ وغیرہ۔ انڈے تو ہمیشہ ہمارے کام آتے ہیں، نہ صرف پیٹ کی آگ بجھاتے ہیں بلکہ کبھی کبھی سر میں بھی لگائے جاتے ہیں۔ غرض کہ بچپن سے شروع ہوتے ہوئے کئی ناکام جلسوں میں اپنی کامیابیاں منواتے ہوئے کبھی کبھی بچوں کے امتحان کے صفحوں پہ جم جاتے ہیں۔ دوسری خبر ہم یوں ملاحظہ فرماتے ہیں۔ "طلوع آفتاب اتنے بج کر اتنے منٹ اور غروب آفتاب اتنے بج کر اتنے منٹ" ہمیں یہ "نظام شمسی" دیکھ کر یہ شعر یاد آجاتا ہے جو ہم باقاعدہ ترنم سے گنگنانے لگتے ہیں ؎

ڈوبتے سورج کو وقتِ شام دیکھ
حُسن والے حُسن کا انجام دیکھ

..... اور پھر اپنی نظر کو آگے بڑھنے کا حکم دیتے ہیں۔ "زیادہ سے زیادہ درجۂ حرارت اور کم سے کم درجۂ حرارت" ہمارے احساس کو جگا دیتا ہے اور ہمارے منہ سے ایک آہ سی نکل جاتی ہے جو کبھی گرم ہوتی ہے تو کبھی ٹھنڈی، گویا ہم 'ہم' نہ ہوئے موسم ہوئے ..... اور پھر موسمی پیش قیاسی کے بھنور میں پھنس جاتے ہیں۔ محکمہ موسمیات کے بموجب دونوں شہروں کے "مطلع" کی اطلاع ہوتے ہی ہم چونک جاتے ہیں۔ "مطلع" واہ کیا بات ہے؟ پھر ہم بھی مطلع لکھنے بیٹھ جاتے ہیں، ابھی قلم ہاتھ میں لیا ہی نہیں کہ آنکھیں پھر بھٹکنے لگتی ہیں۔ چلتے چلتے ان شخصی سطروں پہ رک جاتی ہیں جہاں مسٹر فلاں کی فلاں مقام پر روانگی یا واپسی وغیرہ ..... پھر شہر کی خصوصی کالموں سے ہماری نظر ٹکرا جاتی ہے فلاں کا جلسہ تہنیت، فلاں کی گلپوشی، فلاں ہال میں یا فلاں کلب میں وغیرہ وغیرہ ... بہت سارے وغیرہ ......

اب ہماری چائے ختم ہونے والی ہوتی ہے کہ ہم ڈاک والے کالم پر توجہ کر لیتے ہیں اس میں تو کسی مسائل اور کئی حل لکھے ہوتے ہیں مثلاً اناج کی قیمتیں، ہومیوپیتھی و ایلوپیتھی علاج پر معلومات اور بلدیہ کی عدم تشکایات اور بھی اس طرح کی بہت سی باتیں ... پھر ہماری نظر یں "انتقال پُرملال" کی دردناک خبروں پر سے ہوتی ہوئی شادی اور ولیمہ جیسی پُر مسرت خبروں پر پڑ جاتی ہیں۔ ہم کچھ مسرور ہو جاتے ہیں کہ ابھی ہمارے شہر میں خوشیوں کا سلسلہ جاری ہے۔ حالات زیادہ پریشان کن اگر ہوتے تو بھلا شادی جیسی تقاریب کیسے منعقد ہو سکتیں، کچھ دیر کے لئے ہمارے دل کو قرار آجاتا ہے، پھر ہم مصروفیات کے اس صفحے پر پہنچتے ہیں جس میں کئی مذہبی جلسوں کی اطلاع ہوتی ہے۔ ہم اور بھی مطمئن ہو جاتے ہیں کہ اللہ والے لوگ ابھی دنیا میں بہت ہیں، فی الحال "گھبرانے والی" کوئی بات نہیں۔ پھر ہم "ضرورتِ رشتہ" کے اشتہارات میں اُلجھ جاتے ہیں۔ کئی معقول و نامعقول رشتوں کے اعلانات پڑھ کر غور کرتے ہیں کہ کس کا رشتہ کس سے ہونا چاہیئے۔ جب بات سمجھ میں نہیں آتی تو ہم دوسری ضرورتوں یعنی "کاریگر کی ضرورت ہے" "خادمہ کی ضرورت ہے" جیسے جملوں پر دھیان دیتے ہیں مگر وہاں بھی کچھ پلے نہیں پڑتا تو ہم "برائے فروخت" پر آجاتے ہیں سوچتے ہیں کہ کس طرح "کچھ" بیچ کر مناسب قیمت طے کر کے کچھ خرید لیں۔ پھر ہم "کرایہ پر حاصل کیجئے" پر رکتے ہیں۔ ہمیں ایک کیف سا محسوس ہوتا ہے کہ ہمارے شہر میں بہت سے لوگ ہیں جنہیں مکان کی ضرورت ہے۔ نئی زندگی کی شروعات کرنی ہے۔ اس کا مطلب یہ ہوا کہ زندگی ابھی باقی ہے اور ہم خود بخود مسکرا دیتے ہیں۔ اب

ہم کچھ شعر و ادب کی ہونے والی محفلوں کی طرف نگاہ کا رُخ کرتے ہیں اور وہ اطلاع بھی پڑھتے ہیں جو ایک دن پہلے مشاعرہ کے انعقاد سے متعلق ہوتی ہے۔ ہمارے شہر کے نامور شاعر اور ادیبوں کے نام پڑھ کر ہم بے حد خوشی محسوس کرتے ہیں کہ ابھی باذوق لوگ بھی باقی ہیں۔ محفل شعر و سخن کا مطلب ہے کہ شہر کے حالات بہت اچھے ہیں...... ہے نا؟ اب آپ کو ہم یہ بھی بتادیں کہ اتوار کے دن کا اخبار ہماری جان ہے۔ سوال جواب، لطیفے، غزلیں، مضامین واہ واہ ہم تو باغ باغ ہو جاتے ہیں، اتوار کے دن...... بہر صورت آج کل ہمارے اخبار پڑھنے کا ڈھنگ بالکل بدل گیا ہے۔ چونکہ اخبار کی خبریں بھی بدل گئیں ہیں اور پھر ہم اپنے کمزور دل کے ساتھ دھماکہ خیز خبروں کا تعلق رکھنا بھی نہیں چاہتے، مزید ہمارا دل بے چارہ اور بھی بے چین ہو جاتا ہے جب ہم "تلاشِ گمشدہ" کو پڑھتے ہیں پھر اعزازات نظر سے گذرتے ہیں فلاں کو اعزاز، فلاں کو میڈل وغیرہ ہم پھر سنبھل جاتے ہیں۔ خیر کچھ ہو، اخبار اخبار ہی ہوا نا۔ خبریں چاہے کیسی بھی ہوں، ہمیں اخبار پڑھنے کا شوق ہے اور ہم پڑھنے کی رسم پوری کر لیتے ہیں اور کرتے بھی رہیں گے۔ اس وقت تک جب تک شہر میں اخبار چھپتے رہیں گے۔ یہ الگ بات ہے کہ گرما گرم خبروں سے کبھی ہم جھلس بھی جاتے ہیں....

(سیاست۔ ۹ فروری ۱۹۹۲ء)

-۰- -۰- -۰-

"تنگ آ کے آخر ....!"

اور نہیں تو کیا، آدمی تنگ آجائے تو کیا نہیں کرتا؟ کسی سے جھگڑا ہو تو مار پیٹ پر آجاتا ہے۔ کسی سے خفگی ہو جائے تو بات چیت کرنا بند کر دیتا ہے۔ کوئی بات ناگوار ہو تو مسکرانا چھوڑ دیتا ہے۔ دنیا سے بیزار ہو جائے تو "تارک الدنیا" ہونے سے بھی گریز نہیں کرتا ہے نا؟
مگر ہم نے ایسا کچھ نہیں کیا، صرف "مول تول" کرنا چھوڑ دیا ہے وہ بھی تنگ آ کے ...... قصہ یہ ہوا کہ ہمیں آٹے دال کا بھاؤ۔ خوبیٔ قسمت سے ابھی تک معلوم نہ ہو سکا تو ہم چلے بھاجی ترکاری کا بھاؤ پوچھنے۔ صبح کی چہل قدمی کے دوران ایک بنڈی پر سجی ہوئی دوکان کی طرح ترکاری دیکھتے ہی ہمارے منہ میں پانی بھر آیا۔ ہم چونکہ اس کے وزن سے واقف نہیں تھے، نہ کبھی سبزیاں خریدی تھیں، پتہ ہی نہیں تھا کہ یہ کس تول اور کس مول بکتی ہیں.......
ہم نے بنڈی والے سے پوچھا کہ دس گرام ٹماٹے کیسے ملیں گے؟ بنڈی والا بڑا بدتمیز نکلا، حقارت سے ہنستے ہوئے کہنے لگا، یہ سونا یا چاندی نہیں ہے بائی جی! یہ گرام، درام سب نئے زمانے کی باتیں ہیں، میں تو پرانا آدمی ہوں اور ٹوکرے کے حساب سے ترکاری بیچتا ہوں، زیادہ سے زیادہ ٹوکرا، اور سے کم سیر، آپ نے بی بی! جی گیا ترکاری کبھی نہیں خریدی؟ ہمیں احساس

ہوا کہ ہم واقعی ابھی تک گھانس ہی کھاتے رہے ہیں۔ ہم نے اپنی شان دکھانے کے لئے ایک ٹماٹر کا ٹوکرا خرید لیا، وہ بھی ایک سو پچاس روپے میں، اَب سودا تو ہوگیا۔ سوال تھا کہ ٹوکرا گھر تک کیسے لے جایا جائے۔ ہم جس جگہ چہل قدمی کے لئے گئے تھے وہاں کسی بھی سواری کا دور تک پتہ نہ تھا، بنڈی والے نے ہم پر رحم کھاتے ہوئے ہمارے سر پر کسی طرح ٹوکرا رکھ دیا، کم بخت نے ہماری پیور سلک کی ساڑی کا بھی لحاظ نہ کیا، ہم جیسے جیسے آگے قدم بڑھاتے، ہر قدم پر ٹوکرے کا وزن زیادہ محسوس کرتے۔ پسینے سے ہم اِس قدر بھیگ گئے تھے کہ ہمارے سر سے پسینے کی نہریں گردن تک بہہ کر گردن تک اُترنے لگی تھیں، مگر ہم لال، لال ٹماٹر کے ٹوکرے کو ایک تاج کی طرح سر پر سجائے چلے جا رہے تھے۔ سامنے ایک گیٹ کے پاس ایک "سائیکل رکشہ" سے ایک برقعہ پوش خاتون بڑا سا توشہ دان لے کر اُتریں "رکشہ خالی ہوا۔ اُس نے ہمیں بغور دیکھتے ہوئے پوچھا، کہاں جانا ہے؟ ہم ہانپ رہے تھے، لڑکھڑائی آواز میں کہا" اُدھر" اشارہ ہم نے آنکھوں سے کیا تھا کیونکہ ہاتھ تو ٹوکرے کو جکڑے ہوئے تھے نا!

رکشا والا مسکراتے ہوئے بولا، چھ روپے ہوں گے اور ٹوکرے کے الگ۔۔۔۔

ہم نے کہا ٹوکرے کے پیسے تو ہم بنڈی والے کو دے آئے ہیں، اُس نے کہا تو کیا ہوا؟ رکشہ والے کو بھی دینے پڑتے ہیں۔ اِس نئے قانون سے ہم بالکل واقف نہ تھے۔ خیر! بات دس روپے میں طے ہوگئی۔ کم بخت رکشا والے نے ہمارے سر سے بے دردی کے ساتھ ٹوکرا گھسیٹ کر رکشا کی کشتی میں رکھ دیا اور ہم اپنے

سفر کو سہلانے لگے اور ٹوکرے کو دیکھنے لگے جو ہمارے سر کے کئی بال توڑتے ہوئے ہم سے پہلے رکشا میں جا بیٹھا تھا۔ ہم صبر کا مظاہرہ کرتے ہوئے کسی طرح اُچک کر رکشہ میں بیٹھ گئے۔ رکشہ چلنے لگا، ہم نے ٹماٹروں پر فاتحانہ نظر ڈالی۔ مغزدار، یہ سُرخ ٹماٹر یقیناً میٹھے ہوں گے۔ ہم نے سوچا، جاتے ہی چار، چھ تو یوں ہی اُڑا دیں گے پھر ان کا کچومر بنے گا پھر تھوڑی سی جیلی بھی ہم بنا رکھیں گے تاکہ ناشتہ اور مزہ دے۔۔۔۔ اچانک ٹوکرا رکشہ کی کشتی سے پھسل کر سڑک پر گر گیا اور ہم ٹوکرے کی جگہ آ پڑے، پیچھے سے بھینسوں کا "جم غفیر" آ رہا تھا جس میں سے ایک بھینس نے ہماری رکشہ کو دھکّہ دے دیا تھا۔ ہماری سمجھ میں نہ آیا کہ کیا کریں؟ رکشہ والے نے رکشہ بازو روک دیا اور کہا، بی بی آپ یہ ٹماٹے چن کر ٹوکرے میں واپس ڈال دیں، ہم نے کہا واہ! بھلا ہم کیوں ڈالیں، تم رکھو نا!۔ رکشہ والے نے ڈھٹائی سے کہا، پانچ روپلے اور بڑھ جائیں گے۔ ہم نے پوچھا کیوں؟ تو کہنے لگا اُٹھا اُٹھا کر رکھتے ہیں جو محنت لگتی ہے۔ ہم نے کچھ کم کرنے کو کہا مگر وہ نہ مانا، ابھی ہماری تکرار جاری تھی کہ بھینسوں نے دوڑتے ہوئے ہمارے سارے ٹماٹر روند ڈالے، ٹوکرا بھی "مسطح" ہو گیا۔ رکشہ والا سخت نالائق نکلا۔ بس دانت نکالے کھڑا تھا۔ ہمارے غم کی انتہا نہ تھی۔ جیلی اور کچومر سب کچھ یہیں بن گیا تھا۔۔۔۔ ہم نے سوچا اگر "مول تول" کی بات نہ کرتے تو شائد ایسا نہ ہوتا، اُسی وقت سے ہم نے توبہ کر لی کہ کوئی "مول تول"

کے جھمیلے میں نہ پڑیں گے اور کسی طرح گھر پہنچ گئے۔

گھر میں افراتفری مچی ہوئی تھی۔ ہم نے بچوں سے پوچھا، کیا ہوا؟ بچے ہمیں دیکھ کر چونک پڑے اور اپنے ابّا جان کو پکارنے لگے۔ ہمیں کچھ سمجھ میں نہیں آرہا تھا۔ "ہمارے وہ" بغیر استری کے کپڑے پہنے کہیں نکلنے ہی والے تھے۔ ہمیں دیکھ کر چہرے پر کچھ حیرانی کے آثار نظر آئے۔ پوچھا کیسی ہو؟ زیادہ چوٹ تو نہیں آئی؟ ہڈی تو نہیں ٹوٹی؟ خون زیادہ تو نہیں بہہ گیا؟ ہم اَب بھی نہیں سمجھے۔ پھر انھوں نے بتایا کہ پڑوس کا لڑکا جو دودھ لینے گیا تھا، اُس نے آکر اطلاع دی تھی کہ ہمارا "ایکسیڈنٹ" ہوگیا ہے اور ہمیں بھینسوں نے روند ڈالا .... ہائے! کیا بتائیں ہمارا ہنسی کے مارے برا حال تھا۔ گھر کا یہ وحشت ناک منظر، ہمارے سر کے اُکھڑے بال، اور ہمارے نامدار کے ایک پاؤں میں جوتا اور ایک پاؤں میں چپل ....
اور اِس طرح ہم، تنگ آ کے آخر "مول تول" کبھی نہ کرنے کا عہد کر بیٹھے۔
اچھا کیا نا؟

٭٭٭

ہم اور ہمارے ڈاکٹر

ھمیشہ زبردستی مسکراتے رہنا یا دانتوں کی بے وجہ نمائش کرتے رہنے کو خوشی نہیں کہتے۔ اس کے باوجود ڈاکٹر ہمیشہ خوش رہنے کا مشورہ دیتے ہیں۔ ہمیں یہ مسیحائی آج تک سمجھ میں نہیں آئی کہ ہم چاہیں کوئی بھی تکلیف بیان کریں، ڈاکٹر پہلے خوش رہنے کی تاکید کرتے ہیں اور بعد میں دوائیں تجویز کرتے ہیں، پھر اس کے بعد کچھ پرہیز کی بھی ہدایت کرتے ہیں۔ اگر ہم مان لیں کہ خوش رہنا ہماری صحت کا ضامن ہے تو پھر یہ دوائیں کیوں تجویز کی جاتی ہیں؟ مختلف پرہیز کیوں سمجھائے جاتے ہیں، اور تو اور وزن بھی دیکھا جاتا ہے۔ مختلف ٹسٹ وغیرہ بھی کروانے پر ہمیں آمادہ کیا جاتا ہے۔ آخر کیوں؟

کچھ دن پہلے ہم ذرا یوں ہی "گردشِ دوراں" کی زد میں آ گئے تھے۔ بات کچھ اہم نہ تھی لیکن حساس طبیعت نے ہمیں یقین دلایا کہ ہم ہی "شہر کے قاضی" ہیں۔ ہمیں چکر پہ چکر آنے لگے، اختلاج ہونے لگا۔ کچھ عجیب الٹی پلٹی سی حالت ہو گئی۔ ہم ڈاکٹر کے پاس پہنچائے گئے۔ دو چار "آلوں" کی مدد سے ہمارا معائنہ ہوا۔ پھر ڈاکٹر صاحب نے فرمایا۔ "گھبرانے کی بات نہیں، بیماری کچھ بھی نہیں ہے بس خوش رہیئے!" ڈاکٹر صاحبان "خوش رہیئے" اس آسانی سے کہہ دیتے ہیں جتنی آسانی سے یہ انجکشن کی سوئی چبھو دیتے ہیں اور پھر ہم خوش رہنے کی کوشش ڈاکٹر

صاحب کے "مطلب" ہی سے شروع کر دیتے ہیں۔ دوا کی تفصیل مسکرا کر پوچھتے ہیں، فیس بھی مسکرا کر ادا کرتے ہیں، سلام مسکراتے ہوئے کرتے ہیں اور "خدا حافظ" جیسے سنجیدہ موقع پر بھی مسکراہٹ سے گریز نہیں کرتے۔ یعنی اب یہیں سے ہماری خوشیوں کا سفر شروع ہو جاتا ہے۔ ہم بظاہر بڑے خوش ہو کر گھر لوٹتے ہیں۔ اور حسب ہدایت پرہیز اور دوا کے مرحلوں سے گزر کر اپنے بستر پر آرام سے لیٹ جاتے ہیں۔ گھر والے اپنی ذمہ داری پوری کر کے بے فکر ہو جاتے ہیں اور گھوڑے، گدھے سب ہی بیچ کر سو جاتے ہیں۔ ہم بے قرار سے کروٹ پہ کروٹ بدلنے لگتے ہیں اور سوچنے لگتے ہیں کہ نہ جانے ہمیں کون سا خطرناک عارضہ لاحق ہو گیا ہے کہ ہمیں خوش رہنے کی تاکید کی جا رہی ہے۔ یہ تو بالکل آخری خواہش ہوتی ہے۔ انسان زندگی بھر اس خوشی کی تلاش میں دوڑ دھوپ کرتا ہے مگر یہ ملتی ہی نہیں اب ہم کس طرح خوشی ڈھونڈیں؟ کہاں سے لائیں اس ظالم کو؟

خوش رہنا تو ہم جیسوں سے بہت مشکل ہے، البتہ ہم خوش رکھ سکتے ہیں بہت سے لوگوں کو . . . . . .

ایک مرتبہ ہمیں کسی عزیز کی عیادت کے لئے دواخانہ جانا پڑا۔ مریض کے نامراد دل نے خوشی کی تلاش میں اپنے آپ کو غم سے متاثر کر لیا تھا۔ وہ بیچارے مختلف تاروں اور مشینوں میں اُلجھے پڑے تھے۔ اُن کے بائیں طرف چھوٹا سا ٹی وی بھی تھا جس پر فلم کی بجائے کچھ لکیریں متحرک تھیں۔ اُداس چہرہ، کسمپرسی کا عالم، آنکھیں مدد کی طالب، بات کرنے کی اجازت نہیں تھی۔ پھر بھی ہم آہستہ سے مسکراتے ہوئے ان سے بول ہی پڑے "خوش رہیئے" مرض کچھ بھی نہیں ہے بس خوش رہا کیجئے"

اور خود بہت زیادہ مسکرانے لگے۔ ہمارے عزیز کے قریب کھڑے ہوئے اُداس اقربا نے ہم پر قہر آلود نگاہوں کی بوچھار کر دی اور ہم شرابور ہو کر مسکراتے ہوئے وہاں سے لوٹ آئے۔

یہ مسکرانے کی عادت ہمیں کچھ ایسی پڑی ہے کہ ہم کہیں بھی تعزیت ادا کرنے نہیں جا سکتے، وہاں بھی مسکراتے رہتے ہیں۔ لوگ ہمیں حقارت و ناگواری سے دیکھتے ہیں، یہی نہیں بلکہ ہماری دماغی حالت پر شک بھی کرتے ہیں۔

ڈاکٹر صاحبان وزن کے بارے میں ہمیشہ تاکید کرتے ہیں کہ وزن بڑھنے نہ پائے کم رکھے لیکن ہمیں وزن کم کرنا بالکل پسند نہیں، بھلا "ہلکے لوگ" سماج میں کیسے زندہ رہ سکتے ہیں؟ اگر ہم بے وزنی کا شکار ہو گئے تو ہمارا مضبوط مقام کیسے بنے گا؟ اور خوش رہنے کے سارے راستے بھی مسدود ہو جائیں گے ہے نا؟ ہر طرح کے اسپیشلسٹ ڈاکٹروں کے پاس ہم جا چکے ہیں، سب کا متفقہ فیصلہ خوش رہنے پر ٹھہرا ہے اور ہم مسکراتے مسکراتے عاجز آ گئے ہیں۔ لوگ ہمیں پاگل سمجھ کر نظر انداز کرنے لگے ہیں۔ اب آپ ہی بتائیے کہ ہم ڈاکٹروں کے مشورے پر کسی طرح اور کب تک عمل کریں؟ ہمارا وہ کون سا عمل ہو سکتا ہے جس سے ہم حقیقی معنوں میں خوش رہ سکیں؟

"تبسم بیجا" سے ہمیں کئی بار پریشانی اُٹھانی پڑی، اب کیا بتائیں آپ کو۔ ہم نے ایک فقیر کو راستہ چلتے چلتے ایک سکہ دیا اور مسکرا دیئے۔ فقیر نے وہ سکہ دیکھے بغیر ہی واپس کر دیا۔ ہم نے پوچھا تو کہنے لگا۔ "آپ کھوٹے سکے خیرات میں دیتے ہیں!" ہم نے کہا "ہرگز نہیں!" تو وہ پوچھنے لگا۔

"تو آپ یہ سکّہ دینے کے بعد مسکرائے کیوں تھے ۔ ۔ ۔ ؟

ہم ایک دفعہ آٹو میں کہیں جا رہے تھے۔ جب منزل پر اُترے اور کرایہ دینے لگے تو کرایہ دیتے دیتے آٹو والے کو دیکھتے ہوئے مسکرا دیئے ' اُس نے بہت دیر تک ہمارے دیئے ہوئے نوٹ اُلٹ پلٹ کئے اور بڑی "معنی خیز" نظروں سے ہمیں گھورنے لگا۔ ہم مسلسل مسکرا رہے تھے۔ آٹو والے نے کہا۔ "یہ نوٹ جعلی ہیں اور آپ کے پاس یہ کیسے آئے ؟" ہم مسکرانا بھول گئے۔ ہم نے کہا ! "جعلی نہیں ہو سکتے ' ہم نے یہ بنک سے لئے ہیں" پھر آٹو والے نے پوچھا "تو پھر آپ کی مسکراہٹ کا مطلب ؟" ۔ ہم نے کہا "ہم خوش رہنے کی عادت ڈال رہے ہیں' ہمارے ڈاکٹروں کا مشورہ ہے" ۔ ۔ ۔ ٹھیک کہا نا ؟ ہمیں ڈاکٹروں سے بس یہی شکایت ہے کہ خوش رہنے کی تاکید تو کرتے ہیں ' لیکن خوش رہنے کی ترکیب نہیں بتاتے ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ ==

-٥- -٥- -٥-

"جن پر قابو پانے کے بعد..."

نہ جانے یہ کون سی جگہ تھی، ہم یقین سے تو نہیں کہہ سکتے مگر یہ جگہ قطب شاہی گنبدوں سے بہت ملتی جلتی تھی۔ ہم اجنبی سیاح کی طرح آسمان کی طرف دیکھتے ہوئے زمین پر چل رہے تھے۔ اچانک ہمارے پاؤں کے نیچے ایک پتھر کی بڑی سی سِل آ گئی، یہ کچھ اس زور سے ہلنے لگی کہ ہم لڑکھڑاتے ہوئے اُس شگاف میں جا پڑے جو سِل کے ہٹ جانے سے پیدا ہوا تھا، اندر زینوں کے بجائے "پھسل بنڈہ" تھا جو ہمیں بغیر کسی تکلیف کے سیدھے اُس چراغ کے اندر لے گیا۔ جہاں اُجالوں کی پریاں رقص کر رہی تھیں، بڑے سے اس نقرئی "دیپ" کے اندر "فلیس بلبوں" کی طرح جگمگاتی پریاں دیکھ کر ہمارے دل میں بھی یہ آرزو پیدا ہوئی کہ کاش! ہم بھی پری ہوتے .....!

پھر اچانک اُس دیپ کے اطراف ایک دل جیسا ہالہ نمایاں ہونے لگا اور ہم پر واضح ہوا کہ وہ دل دراصل بڑا سا آئینہ ہے جو ایک بہت بڑے "جن" کے سینے میں آویزاں ہے اور ان پریوں کے عکس کے ساتھ ساتھ ہمارا بھی عکس "جن" کے دل میں دیکھ کر ہم ڈر گئے۔ نہ جانے آگے کیا صورتحال ہو........

ہم نے "جن" کو غور سے دیکھا، بہت ہی گورا رنگ، سر پر دو سینگ، دو دانت باہر، زور سے آگے نکلے ہوئے لمبے سے ناخن، وہ ہمیں دیکھ کر عجب انداز سے

ہنس رہا تھا، پھر وہ سنجیدہ ہو گیا اور سرگوشی میں پوچھنے لگا "کیا چاہیئے؟
ہم نے اپنی دانست میں خشک گلے سے کچھ نگلنے کی کوشش کی اور ساتھ ہی کچھ
کہنے کی بھی، مگر ؎ "کہا نہیں جائے چُپ رہا نہیں جائے" ... جیسی
کیفیت طاری تھی۔ خوف تھا کہ جن ہم پر قابو نہ پا جائے، جن اچانک غائب ہو گیا
پریاں تو پہلے ہی جا چکی تھیں۔ ہم نے "دیپ" کی اُن چمکتی دیواروں کو دیکھا جہاں
سنہری نقش و نگار محل ہونے کا یقین دلا رہے تھے۔ ہم نے کچھ ہلکی سی گرمی محسوس
کی اور گردن پھیر کر دیکھا تو اس دیپ کی لَو سنہرے ہمیں لباس میں جھومتی ہوئی پری
لگی۔ ہم نے اُسے اشارہ کیا تو وہ گھنگھروں جیسی آواز میں بول اُٹھی "جب تک ہوا
کی پری آکر مجھے بجھا نہ دے میں کہیں نہیں جا سکتی۔

ہم نے بس یوں ہی اُوپر منہ کرکے زور سے کہا "اے ہوا کی پری! اس آگ
کی پری کو بجھا کر میرے پاس بھیج دے"۔ اچانک ہمارے بازو سے رنگ برنگے
آنچل لہرانے لگے اور بادِ صبا کے جھونکے مہکتے محسوس ہوئے۔ ہم نے دیکھا رنگ برنگے
آنچل میں لپٹی ہوئی ہوا کی پری آگئی تھی، اور اپنی زلفوں کی مہک سے ہمیں مدہوش کر رہی
تھی۔ اچانک گرمی ختم ہوگئی۔ وہ سنہری "شعلہ پری" غائب ہو گئی، ہم نے ہوا کی پری سے
پوچھا، تمہارا نام کیا ہے؟ اُس نے کہا "صبا ہے میرا نام" اور مسکرادی۔ دیپ میں
رنگین پھول کھِل اُٹھے ..... اور آگے ایک دیوان جو گلابوں کی مسند سے آراستہ تھا
نظر آیا، صبا ہمیں لے اُڑی اور اُس مسند پر بٹھا دیا، ہائے کیا ماحول تھا، بہت بڑے
بڑے گلاب کی پتیوں کے لمس سے بڑی راحت محسوس ہوئی۔ پھر ہمیں ایک تتلی اُڑتی نظر
آئی، یہ بہت بڑی اور بانکی، سجیلی تھی۔ اس کے ہاتھ میں صراحی تھی اور جام بھی، وہ ہمارے

پاس آکر بیٹھ گئی اور جام میں کوئی خوشبودار شئے انڈیلنے لگی۔ پھر ہماری طرف جام بڑھاتے ہوئے کہا "پیو"۔ ہم نے پوچھا "یہ کیا ہے؟" تو کہنے لگی۔ "یہ پھولوں کا رس ہے جو ہم اپنے مہمانوں کو پلاتے ہیں" ہم پھولوں کے رس کی بات سنتے ہی جام پر ٹوٹ پڑے، اللہ، کیا مزے دار رس تھا، ہم نے تقریباً ساری صراحی خالی کر ڈالی اور بڑے سے گلاب کے شبنمی گاؤ تکیہ پر سر رکھ کر سو گئے۔

نہ جانے کتنی ساعتیں گذری، کتنی صدیاں گذریں، ہم گرمی سے جاگ گئے اُف، ہم پسینے میں بھیگ رہے تھے اور وہ "مسندِ گل" مُرجھانے لگی تھی۔ ہم نے پھر اُس گوشے کی طرف دیکھا، وہاں "شعلہ پری" دمک رہی تھی۔ ہم نے اُسے اشارہ کیا، وہ رقص کرنے لگی، ہمیں ایک سیاہ لبادے میں لپٹی ہوئی پری آکر اپنے ساتھ لے گئی جہاں چاند ستاروں کی مسند سجی تھی، ہمیں وہاں بٹھا دیا گیا، ہماری شان بڑھ گئی تھی۔ ایک "ستارہ پری" ہمارے آگے دو زانو ہو کر بیٹھ گئی اور کہا، آپ ہماری مہمان ہیں آپ کو کیا چاہیئے، حکم کیجئے ورنہ "ہمارے محبوب" آ جائیں گے۔ ہائیں یہ کیا ہمارے محبوب، ہمیں فلم "میرے محبوب" کی حد تک ہی معلوم تھا لیکن یہ "ہمارے محبوب ....؟" تو، پری بولی، ہم تمام پریوں کا ایک ہی محبوب ہے اُسے پریاں بہت پسند ہیں، وہ ہمیشہ ہمیں قید میں رکھتا ہے، ایک حصار بنا رکھا ہے، ہم اُس سے آگے نہیں جا سکتیں۔ دراصل ہمارے محبوب کی عادت ہی ایسی ہے کہ وہ کسی کو پسند کر لیں تو قید کر لیتے ہیں۔ ہمارا دل دھڑکنے لگا، پھولوں کا رس بڑی تیزی سے رگوں میں گردش کرنے لگا۔ ہمیں اپنے شوہر اور بچوں کی یاد آ گئی، ہم بہت ہی سنجیدہ ہو گئے اور رو پڑے ہماری آنکھ سے جو بھی آنسو گر رہے تھے وہ پریاں مختلف نقرئی تھالوں میں محفوظ کر رہی

تھیں، کچھ دیر بعد وہی دل کا ہالہ نمایاں ہوا، اور وہی جن ہمارے سامنے تھا۔ پریوں نے جن کے سامنے ہمارے اشکوں کا نقرئی تھال رکھا، جہاں ہمارے آنسو یاقوت و زمرد بنے جگمگا رہے تھے۔ جن حیرت سے دیکھنے لگا، پریوں نے بتایا کہ یہ ہمارے آنسو ہیں، کیا؟ آنسو؟ جن بھرائی ہوئی آواز میں بولا، جی ہاں! پریاں بیک وقت بول پڑیں، تعجب ہے، ایسے لعل و گہر تو میرے خزانے میں بھی نہیں، خیر! یہ سب ہمارے خزانے میں داخل کر دو۔ ہم نے کہا، ٹھہرو! یہ لعل و گہر ہمارے ہیں تم اسے ہماری اجازت کے بغیر نہیں لے سکتے۔ جن نے پوچھا، تمہیں کیا چاہیے؟ ہم نے کہا، آزادی ..... جن نے قطعیت کے ساتھ کہا، نہیں ہم ایسے نادر لوگوں کے دیوانے ہیں جن کے اشک، لعل و گہر ہوتے ہیں، ہم کھسیانے پن میں خواہ مخواہ ہنس پڑے۔ بے شمار موتی ہمارے منہ سے نکل کر بکھرنے لگے، جن کی آنکھیں حیرت سے پھٹی رہ گئیں۔ اشک، یاقوت و زمرد، تبسم، موتی واہ واہ ..... آج سے ہم آپ کے غلام، جن ہمارے آگے عقیدت سے جھک گیا۔ آپ کا جواب نہیں، ہم آپ کی قدر کرتے ہیں، آپ سے محبت کرتے ہیں، یہ پریاں، یہ محل سب آپ کی نذر ہیں۔ آپ کی ہر شرط ہمیں منظور ہے۔ جن بچھا جاتا انداز میں بولتا جا رہا تھا اور ہم اپنے آپ کو مقابلہ کرنے کے لئے دل ہی دل میں تیار کر رہے تھے۔ سوچا کہ جن اب ہمارے دام میں آگیا ہے، کیوں نہ پورا فائدہ اٹھایا جائے۔ ہمیں اپنے گھر کی یاد بے قرار کر رہی تھی۔ ہم اچانک "اداکاری کے میدان" میں اتر آئے اور جن سے اپنی آواز کی لرزش کو چھپاتے ہوئے کہنے لگے۔ ابھی تو آپ نے دیکھا نہیں، اک ذرا ہمیں اپنی دنیا میں بھیجئے، دیکھئے ہم اور کیا کیا لاتے ہیں ہمارے گھر میں دُرِ غلطاں بھی ہیں...

۔۔۔ جن بڑا حزین تھا۔ اُس نے کہا اگر آپ واپس نہ آئیں گی تو ہم آپ کو زبردستی اُٹھا لائیں گے اور اندھیرے قید خانے میں ہمیشہ کے لئے بند کردیں گے۔ ہم نے کہا ہم وعدہ کرتے ہیں۔ جن نے عہدِ وفا کے لئے ہاتھ آگے بڑھایا جس کے لمبے ناخن تلوار کی طرح تھے۔ ہمیں اداکاری کے جوہر دکھانے تھے۔ ہم نے اپنا ہاتھ جن کے ہاتھ میں دینے سے پہلے کہا کہ پہلے آپ وعدہ کریں ہمیں کبھی کوئی نقصان نہ پہنچائیں گے، بقول خود آپ کے آپ ہمیشہ ہمارے غلام رہیں گے' جن نے وعدہ کیا۔ ہم دل ہی دل میں خوش ہو گئے کہ اب ہم بہترین اداکاری پر ایوارڈ حاصل کرسکیں گے۔ ہم نے جن سے کہا ہماری دنیا میں لے چلئے۔ جن نے ہمیں حسرت بھری نگاہ سے دیکھا اپنے گلے سے ایک ہار نکالا جو بے حد وزنی تھا اور ہمیں "ورمالا" کی طرح ہار پہنا دیا ہار کے وزن سے ہماری صراحی دار گردن لچکنے لگی۔ ہم بہرحال برداشت کر رہے تھے۔ پھر ہمیں سب پریوں نے مل کر بڑے خوبصورت انداز میں رخصت کیا۔ شعلہ پری چلّائی میں بھی تمہارے ساتھ چلوں گی اور ایک ہی لمحے میں ہمارے قریب آگئی پھر ایک ستارہ نما پالکی آئی جس میں ہم بیٹھ گئے۔ جن نے ہمیں حسرت سے دیکھا اور پالکی کو اشارہ کردیا۔ یہ پالکی چاند تاروں کے درمیان سے گزرنے لگی۔ اچانک ہمیں محسوس ہوا، صبا کے رنگین آنچل کی مہکتی ہوا ہمارے رخساروں کو چھو رہی تھی۔ ہم نے ادھ کھلی آنکھوں سے جائزہ لیا۔ ہمارے سرتاج ہمارے منہ پر پانی کے قطرے ٹپکا رہے تھے، ہمارے جگر گوشے پنکھا جھل رہے تھے۔ صبح ہو چکی تھی۔ اُجالوں کی ابتدائی ساعتیں تھیں۔ چھوٹی لڑکی نے کہا، اُمّی! آپ نے خواب میں کیا دیکھا؟ ہم نے کہا جن اور پریاں، ہمارے سرتاج بول اُٹھے یقیناً دیکھے ہوں گے۔ رات کو تم نے "اوینڈا" ٹی۔ وی کا اشتہار بہت غور سے دیکھا تھا نا!

--

"تہذیب کے انڈے"

تہذیب کے انڈوں کا نام سُن سُن کر ہمیں بھی اِن انڈوں کا شوق ہوا۔ دوستوں سے پوچھا تو ہنس دیئے، عزیزوں سے پوچھا تو پاگل کہلائے۔ غرض کہ ہماری خواہش "سُنی اَن سُنی" کر دی گئی۔ ہمیں کسی نے نہیں بتایا کہ یہ انڈے کہاں ملتے ہیں؟ ہم نے کئی بڑی بڑی دوکانیں چھان ماریں، چھوٹی چھوٹی دوکانوں کو بھی نہیں چھوڑا! لیکن "تہذیب کے انڈے" نہیں ملے۔ ان کی "عدم دستیابی" سے ہمیں اِن انڈوں کی اور بھی خواہش بڑھ گئی۔ آخر شہر کے گنجان ایک علاقے میں ایک گلی کے آخری سرے پر ایک ایسی دوکان ہمیں نظر آئی جو بالکل خالی تھی۔ مطلب یہ کہ اس دوکان میں کوئی شئے بھی نہیں تھی جسے قابلِ خرید یا فروخت سمجھا جائے۔ اس خالی دوکان میں ایک اسٹول پر "حضرتِ خضر" کی طرح ایک "باریش بزرگ" بیٹھے اپنی نیم وا آنکھوں سے ہمارے تجسس کا اندازہ ہمارے چہرے سے لگانے کی کوشش کر رہے تھے۔

ہم قریب پہنچے تو "حضرتِ خضر" نے ہمیں "السلام علیکم" کہا۔ ہم نے سلام کا جواب اُسی طرح دیا اور دل میں نادم ہوئے کہ اس بار ہم نے بڑی بدتمیزی کر ڈالی ہے ورنہ سلام میں ہمیشہ ہم ہی پہل کرتے آئے تھے خیر! سلام کے بعد کلام بھی اُنھوں نے ہی کیا۔ "کیا چاہیئے؟"، ہمیں اپنی نامعقولیت کا یقین ہو گیا کر

ہم جسے خالی دوکان سمجھ بیٹھے ہیں، وہ خالی نہیں ہے، ورنہ "حضرت خضر" ایسا سوال کیوں کرتے ؟

ہم نے بڑے ادب سے کہا "ہمیں تہذیب کے انڈے چاہیئے . . . .

"حضرتِ خضر" کا کڑک دار قہقہہ ہمیں لرزا گیا۔ وہ مسلسل قہقہے لگا رہے تھے۔ ہم نے اُن کے منہ کی طرف دیکھا، جہاں دانتوں کی قطار کے بدلے مسوڑھوں کے نشان اُس نومولود بچے کی یاد دلا رہے تھے جسے مجبوراً زبردستی شہد چٹایا جاتا ہے۔ ذرا دیر میں جب اُن کے قہقہے تھمے تو انھوں نے پوچھا۔ "کیا کرنا ہے تہذیب کے انڈوں کا ؟"

ہم نے عرض کیا، "جی ہم ناشتے میں آملیٹ اور رات کے کھانے میں پڈنگ کھانے کے عادی ہیں، اگر تہذیب کے انڈے مل جائیں تو ذرا ذائقہ بدلے گا اور شائد تاثیر بھی! ہم شائد تہذیب کے انڈے کھانے کے بعد صحیح معنوں میں صحت مند ہو سکیں گے، کیا آپ ہماری مدد کر سکتے ہیں ؟"

"جنابِ خضر" کی آدھ کھلی آنکھوں پر جھکی ہوئی گھنی بھنویں لمحہ بھر کے لئے "ہلالی" ہو گئیں اور وہ بے نیازانہ فرمانے لگے۔ تہذیب کے انڈے ویسے تو یہاں ملتے نہیں لیکن میں آپ کو ضرور دوں گا، میری کچھ شرائط ہیں، اگر آپ منظور کرلیں تو پھر تہذیب کے انڈے آپ کے ہوں گے۔ ہم نے جی جان سے ان کی شرطیں ماننے کا اقرار کرلیا، تب "حضرتِ خضر" نے فرمایا۔ جب کبھی مہمان آجائیں، چاہے بے وقت ہی کیوں نہ آئیں ان کی خاطر کی جائے؛ ان سے بیزار ہرگز نہ ہوں۔ اگر کوئی آپ کی کسی خوبی سے جلنے لگے تو اپنے ٹھنڈے سلوک سے

اُس حسد کی آگ کو بجھا ڈالو، اگر کوئی آپ کی شان میں گستاخی کر کے طمانچہ مار دے تو دوسرا رُخسار بھی آگے کر دو۔ ہمارے ہاتھ بے اختیار ہمارے رخسار کی طرف بڑھ گئے، ہمیں اپنے رخساروں پر طمانچے کے بعد والی "جلن" کا احساس ہوا۔ پھر بھی ہم سعادت مند شاگرد کی طرح اقرار میں سر ہلاتے رہے۔ پھر جناب خضر نے فرمایا کہ پڑوسیوں کا حال پوچھتے رہو، ان کی ضرورتوں پر نظر رکھنا چاہیئے وہ کسی مذہب کے ہوں یا کسی مرتبے کے اُن سے اپنے قرابت داروں کی طرح پیش آؤ۔

"سو تو ہم کرتے ہیں"۔ درمیان میں ہم بے ساختہ بول پڑے۔ خضر نے کہا ٹھیک ہے اب یہ بتاؤ کہ تہذیب کے انڈے کتنے چاہیئے؟ ہم نے کہا، بہت سارے دے دیجئے نہ ملنے والی شئے کا محفوظ کر لینا ہی بہتر ہے۔ خضر نے پوچھا، گندے ہو جائیں تو؟ ہم نے کہا، ہم انڈے گندے نہ ہونے دینے کا ہُنر جانتے ہیں۔ تو خضر نے کہا "پہلے "آملیٹ" بنے گا یا پہلے "پڈنگ"؟

ہم نے کہا "پہلے آملیٹ، پھر پڈنگ"۔

تو بولے۔ "خدا بھلا کرے انگریزوں کا جو آملیٹ اور پڈنگ تو سکھا گئے مگر خوش اخلاق مُرغی کی وہ نسل اپنے ساتھ لے گئے جو تہذیب کے انڈے دیا کرتی تھی اور ہم اُس زمانے میں آملیٹ یا پڈنگ کے عادی ہرگز نہ تھے۔ ہم مشرقی انداز میں جینے والے لوگ مشرقی کھانے ہی کھایا کرتے تھے۔ آج کل تو ہماری تہذیب کا سورج مغرب سے نکلنے لگا ہے، اس لئے تہذیب کے انڈے مل نہیں پا رہے ہیں۔"

ہم خضر کے وعظ سے بے قرار ہو چلے تھے، پھر کہا "کہاں ہیں انڈے"

اب تو دیجئے ہم نے آپ کی تمام شرطیں مان لی ہیں نا؟ اور بتائیے کہ پیسے کتنے دیں؟"

تو خضر نے کہا: "شرطوں پر عمل کرنے کے بعد آپ کو پتہ چل ہی جائے گا کہ تہذیب کے انڈے کتنے قیمتی ہوتے ہیں!" اور جنابِ خضر نے ادھ کھلی آنکھیں پوری بند کرلیں، آٹو میٹک اُن کا منہ بھی بند ہو گیا۔ شائد آنکھوں اور منہ کا ایک ہی کنکشن تھا۔

ہم "تہذیب کے انڈوں" کے بارے میں سوچتے ہوئے لوٹ آئے...!

-٥- -٥- -٥-

سامنا پانی کی قلت کا

ہم آرام سے بیٹھے عطر کی چھوٹی چھوٹی خالی شیشیوں میں پانی بڑی نفاست سے بھرتے جارہے تھے۔ ہمارے سرتاج نے دیکھا تو پوچھا 'یہ کیا ہورہا ہے؟ ہم نے جواب دیا جی وہ عید کی تیاری' بقرعید آرہی ہے نا.....! عید کی تیاری؟ بھلا ان عطر کی خالی شیشیوں میں پانی بھر کر کیا کرنا ہے؟ انھوں نے پوچھا تو ہم نے متانت سے کہا' کرنا کیا ہے' پانی کی قلت ہے نا اس لئے اب کے ہم عطر کے بجائے شیشیوں میں پانی پیش کریں گے سب کو' انسان تو خاک سے بنا ہی ہے اگر یہ پانی عطر کے طور پر لگا لیا جائے تو کیسی سحر انگیز خوشبو ہوگی سوچئے نا۔ ویسے مٹی کا عطر بھی بڑا قیمتی ہوتا ہے لیکن لوگ پیسے برباد کرتے ہیں وہ بھی عطر خرید کر' پانی یوں بھی آج کل سستا ہے کیا؟ پانی بھرنے کے لئے سرکاری نلوں پر جان کی بازی لگانی پڑ رہی ہے۔ گھروں کے نلوں سے تو اب سسکیاں بھی کبھی کبھی ہی سنائی دیتی ہیں' وہ دور بھی نہیں رہا جب قطرہ قطرہ سمندر بن جایا کرتا تھا' آج قطرے ہی نابید ہو چکے ہیں۔ بے چارے سرتاج ہمارے اس بیان پر حیران ہوتے ہوئے ہم پر تذبذب اور ترحم کی نظر ڈال کر خاموش ہوگئے۔ ویسے بھی شدید گرمی کی لہر جاری تھی۔ انھوں نے ہم سے مصلحتاً پھر کوئی سوال نہیں کیا۔

دراصل پانی کی قلت اور گرمی کی شدت کے بارے میں ہم کافی غور وفکر کرنے کے بعد اس نتیجے پر پہنچے ہیں کہ چاہے کچھ ہو تدبیر کا ساتھ نہیں چھوڑنا ہے۔ بقول شاعروں کے آج کل سبھی کے ہونٹوں پر پیاس جم گئی ہے، آنکھوں کے دریا خشک ہو چکے ہیں۔ اور تو اور جب ہمیں یہ معلوم ہوا کہ شہر کے مرکزی تالاب بھی سرابوں کا منظر پیش کر رہے ہیں تو ہماری آنکھوں میں آنسو آگئے لیکن پلکوں تک آتے آتے وہ بھی ہوا ہو گئے۔ " یاد رآیا ہمیں پانی کا ہوا ہو جانا "

کسی ہندی شاعر نے کہا تھا " تیرے گھڑے میں پانی نہ ہو تو پنگھٹ سے بھر لا ..... لیکن وہ پنگھٹ کہیں نظر نہیں آتے جہاں اس " دردناک " موقع پر ہمیں " چلّو بھر پانی " ہی مل جائے۔ ہم سوچ رہے ہیں، کیوں نہ " راگ ملہار " ان گھڑوں کو بجا بجا کر ہم خود ہی شروع کریں جو عرصے سے خالی رکھے ہیں۔ شاید ابرِ کرم کی خفگی دور ہو ہی جائے اور برس پڑے ہم پر۔ ہماری پیاسی زمین پر سوکھے تالاب پھر سے " فرہاد کی نہر " بن جائیں .... ہم اچھے بھلے لوگوں کو سڑکوں پر " شرافت کا لبادہ " اوپر چڑھا کر یعنی کرپا نچے اوپر چڑھا کر بڑی بڑی بالٹیوں میں پانی بھر کر لڑکھڑاتے ہوئے دیکھ رہے ہیں۔ گنگا جمنی تہذیب کے اس شہر میں ایسی لہر ہم برسوں بعد ہی دیکھ رہے ہیں۔ جب کبھی ہمارے نل میں پانی آتا ہے تو بقول شاعر " نہ کوئی بندہ رہا اور نہ کوئی بندہ نواز " ہم اور ہمارے ملازمین " مساوات " اختیار کرتے ہوئے پانی بھرنے لگتے ہیں حالانکہ " دوڑتے پھرنے کے ہم نہیں قائل " مگر اس دور کے نل بھی بہت بے وفا ہو گئے ہیں نہ جانے ہمیں کب " سوکھے " کا سامنا کرنا پڑے۔ گھر کے اس کونے

سے دوسرے کونے تک ہاتھوں میں مختلف سائز کے برتنوں سے پانی بھر بھر کر محفوظ رکھنے کے لئے ہم نہ جانے کتنے چکر لگا لیتے ہیں۔ یقین کیجئے اگر ان چکروں کا حساب کیا جائے تو ایک حج کا ثواب تو ضرور مل جائے گا۔

ہم نے ایک شادی کے ولیمہ کارڈ پر "جلی حرفوں" میں لکھا دیکھا کہ "براہ کرم اپنے پینے کا پانی اپنے ساتھ لائیں"۔ دعوت صرف "طعام" کی ہے پانی کی نہیں، حالانکہ "آب و دانہ" نصیب کا ہوتا ہے۔ ہمارے پڑوسی اور جنرل اسٹور والے صاحب، دھوبن، ہماری بلڈنگ کے لفٹ مین، واچ مین اور صفائی کرنے والے صاحبان کو ہمارے ہی گھر کا پانی لگتا ہے۔ انہیں پانی بھرنے کی فکر کبھی نہیں رہتی، وہ سب اپنی ضروریات کے لئے ہم سے پانی مانگ لیتے ہیں بلکہ یہ کہا جائے تو غلط نہ ہوگا "ہم پانی بھر رہے ہیں ان کے لئے"، سامنا پانی کی قلت کا ہے نا ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ !

سیاست ۔ ۱۴؍ جون ۱۹۹۳ء

-○- -○- -○-

"ہم اور مکھی"

معلوم نہیں یہ ناک پہ مکھی والا محاورہ کب سے عام ہے لیکن ہم تو حلفیہ کہہ رہے ہیں کہ ہم سچ مچ اپنی ناک پر مکھی نہیں بیٹھنے دیتے اور اس کی انتہائی معقول وجوہات بھی آپ کو بتائیں گے۔

مکھی کے ایک پَر میں "شفا" اور دوسرے پَر میں "سمیّت" (ہلاکت) ہوتی ہے، پھر بھی ہم اس زیر و زبر کی زد میں نہیں آنا چاہتے۔

ہمیں اچھی طرح یاد ہے کہ ایک دفعہ ہماری ناک پر مکھی نے بیٹھنے کا فیصلہ کرتے ہوئے عملی اقدام بھی کر لیا تھا، ہم اس وقت آم کھا رہے تھے۔ ہم نے اُسے اُڑانا چاہا تو آم ہاتھ سے پھسل گیا، ہم گرے ہوئے آم کو حسرت سے دیکھ ہی رہے تھے کہ وہ مکھی پھر ہماری ناک پر آبیٹھی۔ ہمیں سخت غصّہ آیا۔ گویا ہماری ناک نہ ہوئی بلکہ "پلانٹوریم" ہو گئی، جہاں بیٹھ کر ادنیٰ سی مکھی ہماری آنکھوں کے کہکشانی منظر سے لطف اندوز ہونا چاہتی ہے۔ ہمارا غصّہ بڑھنے لگا۔ ہم نے اس زور سے ہاتھ ہلایا کہ ہمارا جسم سارے کا سارا لرز کر رہ گیا مگر کم بخت مکھی ہماری ناک سے ہی چپکی رہی۔ ہم نے ماہر "چڑی مار" کی طرح اپنی ناک کا نشانہ لیتے ہوئے ہاتھ بڑھایا جہاں مکھی قریب سے ہمیں "خونخوار گِدھ" کے برابر نظر آ رہی تھی، جیسے ہی ہمارا ہاتھ ناک پر پڑا مکھی نکل گئی اور ہاتھ ناک پر اس زور سے پڑا کہ دم بھر کو ہماری سانس رکتی

محسوس ہوئی۔ مزید جھلاہٹ میں ہماری نظر اپنے دامن پر پڑی جہاں ناک سے ٹپکتا ہوا خون " قطرہ قطرہ دریا " بننے جا رہا تھا۔

بس، خون پر نظر پڑتے ہی ہمارا دماغ چوپٹ، ہوگیا۔ کم بخت مکھی " بھِن بھِن " کرتی پھر ناک کے پاس آئی اور ہم نے اس " خونِ ناحق " کا بدلہ لینے کے لئے ایک زوردار ہاتھ مارا...... مگر مکھی تو صاف بچ نکلی لیکن ہاتھ پھر سے غلط نشانے پر پڑگیا یعنی پاس رکھے ہوئے دودھ کے گلاس پر، ایک چھناکا ہوا اور شیشے کے ٹکڑے بکھر گئے۔ ہم آم کھاکر دودھ پینے کے عادی ہیں۔ لیکن آم پھسل گیا اور دودھ گر گیا، پھر بھی مکھی ہاتھ نہ لگی، خون مسلسل ٹپک رہا تھا۔ اس کم بخت مکھی نے ہمارا اتنا خون بہادیا لیکن ہم اس کا ایک " پَر " بھی نہ بگاڑ سکے۔ قریب آتی ہوئی مکھی کے پیچھے ہم پھر دوبارہ لپکے۔ اَب کی بار مکھی کے اُڑنے کا انداز ہمیں چیلنج کر رہا تھا۔ ہم نے اس رقص کرتی مکھی کو دونوں ہاتھوں کے درمیان لے کر زور سے تالی بجادی، تالی ماشاء اللہ کافی زوردار تھی۔ جب دونوں ہاتھوں کو دیکھا تو سکندر کی طرح خالی ہاتھ تھے۔ مکھی تالی کے باوجود ہاتھ نہ آسکی۔ اب ناک سے خون کے قطرے زیادہ ہی گرنے لگے تھے۔ ہم نے سر پر ذرا سا پانی ڈالا اور وہیں پڑے صوفہ پر بنا تکیے کے لیٹ گئے۔

ہمارا لیٹنا مکھی کو بھلا کیسے بھاتا؛ وہ پھر بھنبھناتی ہوئی ہماری زخمی ناک پر بیٹھ گئی۔ ہم نے بڑی احتیاط سے اپنی اکلوتی ناک دونوں ہاتھوں میں دبوچ لی اور خالی مٹھیوں کو بھینچ کر کھول دیا، ہم سمجھے کہ مکھی کا شائد جنازہ نکل گیا، لیکن پَروں میں طاقتِ پرواز رکھنے والی مکھی اب بھی ہماری گرفت میں نہ آسکی، مگر ناک بے چاری کا نقشہ بدل گیا۔ ہم تکلیف سے کراہتے ہوئے سامنے سنگھار میز کے آئینے میں

اپنا جائزہ لینے لگے۔ ناک بے چاری کافی پھول گئی تھی۔ خون بہنا کم تو ہوا تھا
لیکن چہرے سے ہم باکسر لگ رہے تھے۔ قریب ہی پھر سے بھنبھناہٹ سنائی دی
ہم حملہ کے بجائے اس بار دفاع کے بارے میں غور کرنے لگے۔ باریک جالی دار دوپٹہ
منہ پر لپیٹ لیا، جیسے آخری دیدار کے بعد کفن لپیٹ دیا جاتا ہے۔ دوپٹہ بہت ہی باریک
جالی کا تھا۔ اس لئے صاف دکھائی دے رہا تھا کہ مکھی ہماری ناک کی تلاش میں اب بھی
سرگرداں ہے۔ اُسے غالباً اندازہ ہوا کہ ہماری ناک "یہیں کہیں" ہے۔ وہ قریب آئی
تو ہماری دفاعی حکمت عملی "شب خون" مارنے پر اُتر آئی۔ ہم نے پھر زور سے اُس پر
جھپٹا مارا۔ ہمیں مُٹھی میں کچھ حرکت محسوس ہوئی، ذرا سا کس دینے کے بعد ہم نے مُٹھی
کھولی تو بسمل کی طرح اُدھ مری ظالم مکھی ہماری ہتھیلی سے چپکی ہوئی تھی۔ ہم نے دوپٹہ
چہرے سے ہٹا دیا اور اُسے حقارت سے دیکھنے لگے۔ ہم ابھی اس "نیم جاں مکھی" کے
بارے میں غور کر ہی رہے تھے کہ کم بخت ایک دم سے اُڑ کر ہماری ناک پر دوبارہ آ بیٹھی
شائد اُسے ہماری ناک سے جنوں کی حد تک عشق ہو چکا تھا ......!
پاس رکھے ایک ضخیم رسالے سے ہم نے خود اپنے منہ پر اتنے طمانچے لگا ڈالے کہ
مکھی تو مکھی اگر سانپ بھی ہوتا تو یقیناً مر گیا ہوتا ......!

اس کے بعد ہم نے کراہنا شروع کیا۔ ناک سے دوبارہ خون بہنے لگا اور
درد سے حالت کی بے حالت ہونے لگی۔ کسی نے ہماری آواز سُنی، ہم کو صرف اتنا
یاد ہے کہ خادمہ کہہ رہی تھی "صاحب! دیکھئے بی بی جی زخمی ہو گئیں"۔ اس کے بعد
ہمیں ہوش نہ رہا ......!!!

--

-- -- --

"کرفیو"

سڑکیں ہمارے دل سے بھی زیادہ سنسان تھیں۔ اگر سوئی بھی پھینک دی جاتی تو یقیناً اُس کی آواز بھی گونج اُٹھتی۔

ہم ہمیشہ "برائی" کے پہلو میں سوئی ہوئی "خوبی" کو ڈھونڈ لیتے ہیں اور اُسے پوری طرح بیدار کر دیتے ہیں۔ اب یہی دیکھئے نا، کرفیو کے اذیت ناک اور دردناک پہلو میں خوابیدہ ایک خوبی آخر ہم نے ڈھونڈ ہی لی۔ ہر عمر اور ہر مذہب کے لوگ کرفیو کی وجہ سے ذہنی انتشار میں رہتے ہوئے بھی زندگی کی ضرورتوں کو کسی نہ کسی طرح پوری کرتے ہی رہتے ہیں۔ خاص طور پہ ہم خواتین تو ماحول کو سازگار بنانے میں اپنا ثانی نہیں رکھتیں، ہے نا!

ہمارے پڑوس میں غالباً مونگ کا حلوہ بن رہا تھا، خوشبو بے چین کئے دے رہی تھی۔ ویسے بھی ہماری "قوتِ شامہ" غیر معمولی ہے اور پھر کرفیو تو انسانوں پر نافذ ہوتا ہے۔ خوشبو پر تھوڑا ہی نافذ ہوتا ہے؟ اِدھر کی خوشبو اُدھر، اُدھر کی خوشبو اِدھر۔۔۔ خیر! ہمارا دھیان سارا کال بیل کی طرف تھا کہ بس اب بیل بجے گی اور پڑوسن بھابی ہمارے دروازے پر حلوے کا حصّہ لئے کھڑی ہوں گی۔۔۔۔۔۔۔ اور پھر ہوا بھی ایسا، اُنھوں نے حلوے کا حصّہ پیش کرتے ہوئے ہم سے سوال کیا کہ "تم نے کرفیو میں کیا کیا پکایا؟" ہم نے بتایا کہ ہم نے

صرف دہی بڑے اور سموسے ہی غریبی موافق بنائے ہیں، میٹھا تو ہم نہیں بنا سکے اور اس طرح پکوان کا تبادلہ ہوتا رہا۔

اس کے بعد ہمارا پروگرام اڑوس پڑوس کے گھروں میں بیٹھ کر حالاتِ حاضرہ پر سیاسی لیڈروں کی طرح تبادلۂ خیال کرنے کا تھا۔

گنجان آبادی والے شہروں میں ہنگامہ کوئی عجب بات نہیں۔ اس ہنگامے کو روکنے کے لئے اگر کرفیو نافذ ہو جائے تو ہمیں اتنی تو فرصت مل جاتی ہے کہ کچھ مزیدار پکوان کر کے پڑوسیوں سے "گپ شپ" کر کے وقت گذارا جائے۔ عام طور پر کرفیو میں ہماری قابلیت میں اضافہ ہو جاتا ہے بلکہ وہ سیاسی صلاحیتیں بھی اجاگر ہونے لگتی ہیں جنھیں ہم کبھی سر اُٹھانے کا موقع نہیں دیتے۔ ہم اپنے پڑوسیوں میں اسی لئے بے حد مقبول ہیں اور ہمارے خوش حال پڑوسی کرفیو کے منتظر رہتے ہیں تاکہ وہ ہماری اُن صلاحیتوں سے مستفید ہو سکیں جو ہمیں شائد کسی وقت "قوم کا لیڈر" بنانے میں کارآمد ہوں گی۔

ہمارے پڑوسیوں کا خیال ہے کہ ہم الیکشن میں بغیر "بیساکھی" کے کھڑے ہو سکتے ہیں۔ ہاں! تو ہم کرفیو کے دوران مزیدار پکوان کر کے لطف اندوز ہونے کے بعد کسی پڑوسن کے یہاں وقت گذارنے چلے جاتے ہیں، جیسے بڑی شخصیتیں گرما کے موسم میں ٹھنڈے مقامات پر جایا کرتی ہیں۔

ہم اپنی پڑوسنوں سے تبادلۂ خیال کرتے ہیں۔ جھگڑے، فساد اور افواہوں کے تذکرے کرتے ہوئے اُن غریبوں کی یاد بھی دلاتے ہیں جو کرفیو کی وجہ سے مزدوری کے بغیر گھر میں فاقے کر رہے ہوتے ہیں اور ہم ایسے موقع پر کچھ ایسی دردمندی

سے بیان شروع کرتے ہیں کہ سننے والوں کی آنکھوں سے رم جھم شروع ہو جاتی ہے، ہم بھی اپنا دامن بھگو لیتے ہیں۔ ہم انتہائی خلوص کے ساتھ پڑوسنوں سے غریبوں کی مدد کے طالب ہوتے ہیں اور ہمارا دستِ طلب آگے بڑھا دیتے ہیں۔ ذرا سی دیر میں اناج، پیسے، کپڑے اور برتن جمع ہو جاتے ہیں اور ہم اپنے امدادی قافلے کے میر کارواں بن کر نکل پڑتے ہیں۔

جب ہم اپنی نظر سے ملک کے حالات کا جائزہ لیتے ہیں تو ہمیں اپنے وطن عزیز پر بڑا رحم آتا ہے۔ ہائے یہ محبت بھرے رنگ بھرے گلستاں میں " ٹڈی دل " کی طرح اقتدار کی تمنا حملہ آور ہو کر ماحول کو کس قدر ویران کر دیتی ہے۔

کسی جہاندیدہ پڑوسن کے منہ سے چند تسلّی آمیز جملے سُن کر ہم مطمئن ہو جاتے ہیں کہ بقول ان کے کرفیو کے لیے جھگڑے بند ہو جائیں گے اور پہلے کی طرح پھر سے حالات نارمل ہو جائیں گے اور اس احساس کے ساتھ ہمیں مونگ کا حلوہ پھر یاد آجاتا ہے اور ہم پھر وہاں سے کام کا بہانا کر کے حلوے والی بھابی کے پاس جا دھمکتے ہیں۔ ہماری بڑی آؤ بھگت ہوتی ہے۔ ویڈیو پر اچھی سی فلم لگا کر ہمیں روکنے کے انتظامات کرتے ہوئے حلوے والی بھابی بھی سیاست بگھارنے پر تُل جاتی ہیں۔ "بھئی، اب یہ حالات سہے نہیں جاوت ہیں من بڑا بوجھل ہوا جار ہا ہے یہ سوچا کر کے من بہلانے کے لئے میں نے حلوہ بھون لیا تھا۔" حلوے کی پلیٹ صاف کر کے ہم دوسری بھابی کے یہاں جا پہنچے جہاں پر شامی کباب بن رہے تھے۔ کچھ مہمان بھی اُن کے گھر کرفیو کی وجہ سے پھنس گئے تھے۔ بہرحال وہاں بھی ہمارے لئے کرسی موجود تھی۔ کرفیو پر کچھ پریشانی اور افسوس کا اظہار کرتے ہوئے ہم نے کہا کچھ ہو کرفیو سے بظاہر کام رُک تو جاتے ہیں مگر دلوں کے قریب ہونے کا موقع اس سے بہتر کوئی نہیں ......!!

--

ضرورت ہے....؟

؎ "دو چار ہاتھ جب کہ لبِ بام رہ گیا"

عمر اور صحت نے ہم سے آنکھیں چُرانی شروع کیں۔ پُرانے ملازمین کچھ تو اللہ کو پیارے ہو گئے۔ جو بچے وہ کام کاج کے قابل نہیں رہے۔ غرض کہ ہمارے گھر میں ملازمین کی قلت پانی سے بھی زیادہ ہو گئی۔ ہم نے ہر آنے جانے والے سے کہا کہ ہمیں "خادمہ" چاہیئے۔ یہاں تک کہ اخبار لانے والے، دھوبی، ترکاری والے اور اڑوس پڑوس، سب ہی کی ہم نے جان کھانی شروع کر دی۔

ایک بار ہم کہیں جاتے ہوئے راستے میں رُک کر مٹھائی خرید رہے تھے تو ایک بھکارن نے ہمارے پاس آکر "اللہ کے نام پہ" کہتے ہوئے اپنا "دستِ حنائی" ہمارے آگے کر دیا۔ ہم نے اپنے "دستِ عطا" کو آگے بڑھانے سے پہلے اُسے غور سے دیکھا۔ معقول ناک نقشہ، قابلِ رشک صحت، اور اچھے خاصے کپڑوں میں وہ ہمیں بھکارن بالکل نہیں لگی۔ ہم نے پوچھا۔ "ہمارے یہاں کام کرو گی ــ؟"
اُس نے پوچھا۔ "تنخواہ کیا ملے گی ؟"

ہم نے کہا۔ "جتنی بار چاہو کھانا کھاؤ، جو چاہو پہنو، تنخواہ چار سو روپے"
وہ کچھ سوچنے لگی، پھر کہا۔ "پڑتل نہیں پڑتی۔" اور آگے بڑھ گئی۔ بنا بھیک لئے بڑھ گئی ....!

ہم نے پھر ایک تدبیر کی وہ یہ کہ اخبار میں اشتہار دے بیٹھے۔ "خادمہ کی ضرورت ہے" اور اپنا ٹیلی فون نمبر بھی دے دیا۔

فون پر فون آنے لگے، ہم آپریٹر کی طرح فی منٹ کے حساب سے فون ریسیو کرتے جا رہے تھے۔ مختلف سوالوں کے جواب ہمیں دینا پڑ رہا تھا۔ ہمارے سوال کرنے کی گنجائش ہی نہیں تھی، مثلاً ہم سے کئے ہوئے سوالات ملاحظہ ہوں۔

کیا کام کرنا ہوگا؟ کتنے آدمیوں کا کام ہے؟ کتنا پکوان کرنا ہے؟ تنخواہ کیا ملے گی؟ کھانا کتنی دفعہ؟ کھانے میں کیا کیا؟ پینے میں کیا کیا...؟ سونے کے لئے جو روم دیا جائے گا اس میں "اٹیچ باتھ روم" ہے یا نہیں؟ گھر میں ریفریجریٹر ہے یا نہیں؟ ٹی وی ہے یا نہیں...؟ وی سی آر ہے یا نہیں؟ کتنی فلمیں روز دکھائی جائیں گی؟ ہر ماہ کپڑوں کا ایک جوڑا ملے گا یا دو؟ چائے کے لئے الگ دودھ ملے گا یا پینے کے دودھ میں ہی گنجائش نکالنا ہوگا؟ نہانے کے لئے دیسی صابن یا غیر ملکی؟ شیمپو کونسا ملے گا؟ ہفتہ میں ایک دن گھومنے لیجایا جائے گا یا نہیں؟ عید کے موقع پر کارچوب کے کام کا جوڑا ملے گا یا تاشقند کا؟ طبیعت خراب ہو تو ڈاکٹر کو گھر پر بلائیں گے یا ہاسپٹل لے جائیں گے؟ صاحب کتنی "پاکٹ منی" دیں گے؟ اور بیگم صاحبہ کتنی؟ پندرہ دن میں ایک بار سینما لے جائیں گے یا مہینے میں ایک بار؟ رات کے کھانے میں پڈنگ ہوگی یا صرف شیک؟ صبح میں گھی کے پراٹھے ملیں گے یا مکھن لگے ٹوسٹ؟ انڈا اُبلا ہوا دیں گے یا آملیٹ؟ دوپہر میں شامی کباب دیں گے یا صرف تلا ہوا گوشت؟ رات کے کھانے میں چکن سوپ کے ساتھ سینڈوچ ملیں گے یا

شیرمال؟ ہر چوتھے دن مرغ پلاؤ ملے گا یا تلی ہوئی مچھلی ؟ خواہش کے وقت چائے دم کی ملے گی یا پکی ہوئی؟ پان کے "بیڑے" کے ساتھ خوشبو کی گولی ملے گی یا نہیں ؟ کپڑوں پر استری دھوبن کرے گی یا لانڈری والے؟ سر میں لگانے کے لئے پھولوں کا گجرا ملے گا یا صرف ایک گلاب ؟ بجلی کی جھاڑو گھر میں ہے کہ نہیں ؟ کپڑے دھونے کا آٹومیٹک مشین ہے یا نہیں ؟ مہندی لگانے کے لئے بیوٹی پارلر جانے کی سہولت ہوگی یا گھر پر ہی کوئی مہندی لگا دے گا ۔ ۔ ۔ ۔؟

ان سوالوں نے ہمیں آخر اس منزل پر پہنچا دیا جہاں ہم نے فیصلہ کیا کہ خادم کا نہ ہونا ہی بہتر ہے ۔ بڑی بے بسی سے ہم غالب کا یہ شعر دہراتے ہیں کہ

بازیچۂ اطفال ہے دنیا مرے آگے
ہوتا ہے شب و روز تماشہ مرے آگے

"دوستوں نے بھی کیا کمی کی ہے"

کسی شاعر نے کہا ہے ؎

دشمنوں نے تو دشمنی کی ہے
دوستوں نے بھی کیا کمی کی ہے

ہمیں اس شعر پر خیال آیا کہ کیوں نہ ہم بھی کچھ عرض حال کریں، کیونکہ ہمارے "سرِ مبارک" میں جتنی بھی عقل ہے وہ قطعی ہماری اپنی ہے، بالکل ذاتی ہے ہم اس معاملے میں بڑے خوددار واقع ہوئے ہیں، ذرا دیر کے لئے بھی کسی سے نہ عقل مانگتے ہیں نہ قرض کے طور پر اُدھار لیتے ہیں، ہمیں اس "ذاتی عقل" پر بڑا ناز ہے۔ ہاں! تو ہم بات کر رہے تھے دوستوں کی! ہوا یوں کہ ایک دفعہ ہماری پرانی سہیلی بہت عرصہ بعد ہمارے یہاں آئیں، ہم کو دیکھتے ہی دردناک چیخ ماری اور ہم سے بے ساختہ لپٹ کر مغموم لہجے میں کہنے لگیں ہائے، یہ تمہارا کیا حال ہو گیا ہے؟ سوکھ کر کانٹا ہو گئی ہو، آنکھوں کے اِرد گرد سیاہ حلقے، ہونٹ سوکھے ہوئے آخر کیا دُکھ ہے تمہیں؟ کیا کوئی عارضہ لاحق ہو گیا ہے؟ ہم کسی بھی "عارضہ" کو ناحق بدنام کرنے کے حق میں نہیں تھے، ہم نے کہا۔ "ایسا کچھ نہیں، بس کچھ دن سے کمزوری محسوس ہو رہی ہے۔ کام کی زیادتی سے کھانا ٹھیک طرح نہیں کھایا جاتا"

بہرحال ہماری دوست نے ہم کو بار بار تاکید کی اور قسم بھی دی کہ ہم اپنی صحت بنائیں، اپنا دھیان رکھیں، کھانا پیٹ بھر کھائیں، اچھی اچھی غذائیں پابندی سے لیا کریں، پھلوں کا استعمال تو کام کاج کے دوران بھی ہوتے رہنا چاہیے، وغیرہ وغیرہ . . . . . ہمیں اپنی دوست سے محبت اور بھی بڑھ گئی کہ بے چاری ہم کو کتنا چاہتی ہے اور ہم نے ان کے مشورہ پر عمل کرنا شروع کردیا۔

کچھ عرصہ گذرا ہماری ایک اور دوست آئیں۔ اِن صاحبہ نے ہم سے ملتے ہی کہا اُفوہ، باپ رے باپ! تم کتنی موٹی ہوگئی ہو؟ رنگ تو خیر پہلے بھی کم نہ تھا مگر اب موٹی بھی ہوگئی ہو، اتنا وزن کیوں بڑھ گیا؟ اس سے دل کا عارضہ ہوجائیگا آج کل تو گوشت کا وزن ہڈیاں بھی نہیں سنبھال سکتیں، اگر کبھی اتفاق سے کہیں گر پڑوگی تو اُٹھ نہ سکوگی اور موٹے لوگ ہی قلب کے مریض ہوتے ہیں کہیں ایسا تو نہیں کہ تمہارے جسم میں پانی بھرنے لگا ہے؟ اب ہمارا بلڈ پریشر ان کے خوف ناک اندیشیوں سے واقعی بڑھ گیا۔ ہمیں محسوس ہوا کہ ہم واقعی "گاما پہلوان" کا نگیٹیو نہ سہی کاربن کاپی تو ہو ہی گئے ہیں۔ ویسے دل کو یہ اطمینان تھا کہ ہمارے جسم میں پانی نہیں بھر سکتا کیونکہ ہم کسی بھی طرح "واٹر کولر" تو ہیں نہیں! مزید ان خاتون نے ہماری انگلیاں دیکھیں اور افسوس کا اظہار کرتے ہوئے کہنے لگیں۔ ہائے ہائے کتنی نازک انگلیاں تھیں، اب تو دیکھو کیسی ہوگئی ہیں؟ یہ کچھ دن بعد تم کوئی بھی چیز اپنے ہاتھ سے نہ پکڑ سکوگی۔ انھوں نے مزید پیش قیاسی کی، ہم گھبرا گئے، اللہ! نہ جانے کیوں ہم ایسے ہوگئے، ہم نے اللہ میاں سے دُعا مانگی کہ یا اللہ! اب ہم کیا کریں؟ کوئی کہتا ہے حالت رہ گئی، کوئی کہتا ہے وزن

بڑھ گیا۔۔۔۔ "یا شافی تو کافی" اور اللہ میاں کو منانے کے لئے کئی مناجاتیں ہم نے دل ہی دل میں پڑھ ڈالیں۔ آخر ہماری طبیعت ایک دن بگڑ ہی گئی۔ ڈاکٹر نے دیکھا اور کہا، کوئی خاص بات نہیں وزن بڑھنے سے اختلاج ہو رہا ہے غذا میں احتیاط کریں۔ ہم نے ڈاکٹر صاحب سے وعدہ کیا کہ ہم اب عمر بھر ایک نوالہ کھانا بھی نہیں کھائیں گے۔ ڈاکٹر صاحب بولے، جی نہیں، کھانا تو آپ کو کھانا ہے اور زندگی بھر کھانا ہے فقط نشاستے والی چیزیں، مرغن غذائیں نہ لیجئے، پراٹھوں کے بجائے چپاتی لیجئے وغیرہ وغیرہ، یعنی ہم جو پہلے تین دفعہ پھلوں کا رس، دو دفعہ دودھ اور تین وقت "مغلائی کھانے" کھا رہے تھے وہ سب منع کر دیئے گئے "مغلائی ڈش" پر پابندی عائد کر دی گئی، اس کے بجائے ہمیں وٹامن کی گولیاں عنایت کی گئیں اور ہم میدان جنگ پر جانے والے سپاہیوں کی طرح علاج کے لئے تیار ہو گئے اور ڈاکٹر صاحب کے حسب ہدایت، غذا، چہل قدمی، وٹامن کی گولیوں پر آ گئے۔ کچھ عرصہ بعد ہماری وہی پہلے والی سہیلی دوبارہ آئیں ہمیں دیکھا اور بولیں، ارے! تم تو بہت اسمارٹ لگ رہی ہو، کیا یوگا کرنے لگی ہو؟ اپنی عمر سے کئی سال چھوٹی لگ رہی ہو، ذرا بتاؤ تو یہ انقلاب کیسے ہوا؟ ہم نے کہا تمہارے طفیل میں! انھوں نے پوچھا کیسے؟ ہم نے کہا نہ تم ہمارے ناتواں وجود پر پریشان ہوتیں نہ ہم محنت کر کے "گاما پہلوان" بننے کی کوشش کرتے نہ پھر ہمیں ڈاکٹر دل کا صحیح مشورہ ملتا نہ ہم عمل کر کے اسمارٹ بنتے، پھر ذرا دیر کے لئے دل میں ندامت کا احساس ہوا کہ ہم نے اپنی عقل کے بجائے، دوسرے کی عقل استعمال کی تھی جس کا نتیجہ آپ دیکھ رہے

ہیں، ہے نا ؟ بات یہیں ختم نہیں ہوتی "دوستوں کی دوستی" کا ذکر ابھی باقی ہے ویسے ہمیں اندازہ ہے کہ ابھی آپ بور نہیں ہوئے اور ہم اپنی بات اس وقت تک ختم نہیں کرتے جب تک کہ ہمیں احساس نہ ہو کہ آپ بور ہو چکے ہیں، ہاں تو ہم کہہ رہے تھے ایک اور صاحبہ جو ہماری دوست ہیں اُنھیں عورتوں کے بناؤ سنگھار سے بڑی دلچسپی ہے بلکہ دلچسپی ہی کیا وہ خود چلتا پھرتا "بیوٹی پارلر" ہیں، ہم ایک دفعہ کسی شادی میں جانے کی تیاری میں "جی جان" سے لگے تھے وہ آگئیں اور انھوں نے ہمارا حلیہ دیکھ کر کہا، تم کیا اس حالت میں شادی میں شریک ہوگی ؟ ہم نے پوچھا، کیوں کیا ہمارا حال بُرا لگتا ہے ؟ اُنھوں نے قہقہہ لگایا اور ہمیں اپنے دونوں ہاتھوں میں دبوچ لیا اور اس کے بعد بہت ساری چیزیں اپنے پرس میں سے نکالیں اور ہمارے چہرے کی کافی مرمت کر ڈالی اس کے بعد ہمارے بکھرے گیسو ان کی مضبوط گرفت میں آگئے اور ہم آہ کئے بنا ان کے آگے جُھکے رہے کچھ دیر بعد اُنھوں نے آئینہ ہمارے سامنے کر دیا، ہائے کیا بتائیں ؟ بخدا یہ ہمارا عکس نہیں تھا، ہرگز نہیں تھا۔ ہم اس طرح کے کبھی نہیں تھے، کہاں سیدھے سادے چہرے کی اصلیت اور کہاں یہ آنکھوں کے اطراف نیلے حاشیے، رخساروں پر بے وقت کی شفق، اور ہونٹوں پر بے موسم گلاب کی سُرخ کلیاں، سر پر بالوں کا اُلٹا ہوا سا پیالہ، آہ یہ ہم تو نہ تھے، ہم ہرگز نہ تھے، آئینہ تو ہمیں اپنی پہچان دینے کے لئے ہوتا ہے، لینے کے لئے نہیں، ہم نے شادی میں جانے کا ارادہ ملتوی کر دیا مگر گھر والوں نے ہمیں مجبور

کہہ دیا کہ رشتہ داری کا معاملہ ہے جانا ضروری ہے خیر، کسی طرح ہم شادی
میں پہنچے ہم شرم سے جھکے جھکے شادی میں شریک رہے کئی خواتین نے
ہمارے اس انداز کو سراہا، اور بڑی بوڑھیوں نے تنقیدی نگاہوں سے گھورنا
شروع کیا، اب ہم حواس کھونے لگے تھے، کچھ خواتین جو ہماری بے تکلف
دوست تھیں ہمارے گرد ہالہ بنا کر بیٹھ گئیں ہم پشیمان، سب سے نظریں
چرائے بیٹھے رہے جیسے کہ ہم نے کوئی جرم کیا ہو" خدا خدا کر کے واپسی کا وقت
ہوا ہم حواس باختہ سیڑھیوں سے اترتے ہوئے لڑکھڑا کر گر پڑے کیونکہ ہماری
"بیوٹیشن دوست" نے ہماری ساڑی بھی کچھ اس طرح باندھی تھی کہ چلنا دوبھر
ہو گیا خیر، تو ہم جیسے ہی گرے ہمارے بال جو اونچے اسٹائل میں بندھے تھے کھل
کے بکھر گئے۔ ہم بے انتہا پشیمانی کے عالم میں گھر پہنچے اور سیدھے آئینے کے سامنے
بنا سر کھڑے ہو گئے۔ چہرہ رنگین، بکھرے بال، وحشت زدہ سے ہم کھڑے
سوچنے لگے —

دوستوں نے بھی کیا کمی ہے ....!

ہم اور آئینہ

شکستہ آئینہ، نگاہِ آئینہ ساز میں عزیز ہوتا ہے لیکن ہم غیر شکستہ آئینہ کو باکمال سمجھتے ہیں کیونکہ جب تک ہم اپنا پورا چہرہ نہ دیکھیں بھلا خود کو پہچان کیسے سکتے ہیں؟ اگر ٹوٹے ہوئے چہرے پہ بے ترتیب کئی بال پریشان نظر آئیں گے اور ہم "اصلاحِ معاشرہ" کی طرح خود کو سنوارنے کی ناکام کوشش کرتے ہوئے احمق ہی لگیں گا؟ "آئینہ" دل تو ہوتا نہیں جو ٹکڑے ٹکڑے ہو کر بھی کام آتا ہے۔ ۔ ۔ ۔ ۔ پھر بھی نہ جانے کیوں ہمیں ٹوٹا ہوا آئینہ پھینکنے کو جی نہیں چاہتا۔ ہمیں بچپن کا وہ حادثہ یاد آجاتا ہے جس سے ہم بڑے کروفر کے ساتھ گذرے تھے۔

گھر کا صحن بہت ہی بڑا تھا۔ دائیں طرف ایک گوشے میں باغبانی کے شوق کا مظہر تھے وہ پودے جو ہمیں دیکھ دیکھ کر جھومتے رہتے تھے۔ ہم نے ایک کونے میں ٹکوتی لگنے والی اینٹوں کا ڈھیر اور لال مٹی یوں ہی ڈال رکھی تھی۔ یہ ڈھیر کافی اونچا ہو گیا تھا۔ ۔ ۔ ۔ ہمارے قد کی طرح ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ ! وہیں دیوار کے اوپر ایک دفعہ بہت ہی خوبصورت بڑی سی پتنگ آکر اٹک گئی۔ باہر سے مسلسل کوئی ڈور کھینچ رہا تھا۔ بھلا اس پتنگ کی بساط کیا تھی۔ ہم نے بقول غالب ؎ "اُٹھ کے قدم پاسباں کے لئے" جناب سنک چمپین کی طرح اُچک کر اس پتنگ کو تھام لیا، ڈور سے پتنگ الگ ہو گئی اور اسی لمحہ ہمیں احساس ہوا کہ ہمارے پاؤں کے نیچے کوئی انگارہ آگیا ہے ہم نے

اس "ٹیلے" سے اتر کر پتنگ کو گلے لگا لیا، ہلکے پیازی رنگ کی پتنگ پر سیاہ بارڈر کے ساتھ دو سرخ دائرے بڑے دلکش لگ رہے تھے۔ ہم کسی طرح وہیں مٹی کے ڈھیر پر بیٹھ گئے۔ پتنگ دوسری طرف رکھی اور اپنے تلوؤں کو اُلٹ کر دیکھا، جہاں بڑا سا نکوتی آئینہ کا ٹکڑا ہمارے تلوے میں "جائے پناہ" ڈھونڈتے ہوئے اس قدر اندر جا چکا تھا کہ ہمیں اس کا کچھ حصہ جو باہر تھا پکڑ کر کھینچنے میں مشکل ہو رہی تھی، خوبصورت پتنگ کے حصول کے بعد درد کا احساس ہوا مگر اس وقت تک آئینہ کا تین تا چار اینچ کا ٹکڑا ہمارے تلوے میں پوری طرح دھنس گیا تھا۔ خیر کسی طرح ہم نے ہمت کر کے وہ آئینہ کا ٹکڑا کھینچ نکالا ..... ایک آہ بھی ہمارے منہ سے نکل گئی ......

اور اس کے بعد خون کی موٹی سی دھار ہمارے تلوے سے بہہ نکلی۔ ہم نے بڑے غور سے دیکھ رہے تھے زمین پر موٹی سی سرخ دھار بڑھتی جا رہی تھی اور صحن کے اونچے حصے سے ہوتے ہوئے وہ نیچے آگئی۔ ہم بدستور کبھی "لہو کا رنگ" دیکھتے تو کبھی پتنگ دیکھتے، ہمیں خادمہ کی چیخ سنائی دی خو....و....و....ن .... اور گھر والے ہماری طرف دوڑ پڑے۔ ہمیں وہیں "فرشِ خاک" پر لٹا دیا گیا، پاؤں کے نیچے تکیہ رکھ کر پاؤں اونچا کیا اور مختلف گھریلو نسخے خون روکنے کے لئے آزمائے جانے لگے، کسی خادمہ کے منہ سے نکلا "اے ہے، خون بہہ جانے سے چہرہ سفید پڑ چکا ہے" ہم نے ضد شروع کی کہ ہم اپنا "سفید چہرہ" دیکھیں گے "آئینہ لاؤ" ہمیں خون بہنے سے زیادہ سفید چہرے کی فکر پڑ گئی، آخر کافی تکرار کے بعد ہمارے سامنے "بیچم" کا آئینہ لایا گیا، لیکن ہمیں خادمہ کے جھوٹ پر بہت غصہ آیا۔ ہمارا چہرہ سفید ہرگز نہیں تھا، ہمارے گلابی چہرے پر درد کا سرخ رنگ نکھر آیا تھا ......

پاؤں سے کھینچ کر نکالے ہوئے آئینے کے ٹکڑے کو ہم نے طلب کیا اور اُس میں اپنا چہرہ دیکھا تو عجیب سا لگا۔ شیشے کو پارہ سے آراستہ کیا جائے تو آئینہ ہو جاتا ہے ورنہ صرف شیشہ ہی رہتا ہے۔ اس شیشے کے اُس پار ہمیں اپنے "چارہ ساز" نظر آرہے تھے جو ہمارے پاؤں کی مرہم پٹّی میں لگے تھے۔ اس شیشے کو دیکھتے ہی ہمارا پارہ چڑھ گیا اور اُسے اتنی زور سے زمین پر دے مار کر پارہ پارہ ہو گیا۔۔۔۔! ہمیں اپنے بازو رکھی ہوئی پتنگ یاد آئی جسے ہم نے جانباز سپاہی کی طرح خون بہا کر حاصل کیا تھا۔

ہم نے پھر بڑا سا آئینہ دیکھا، اب چہرے پر درد کا رنگ گہرا نہیں تھا بلکہ پتنگ کی خوشی شفق بن کر دمک رہی تھی۔

ہم کو اپنے زخم کی جلن کم ہوتی محسوس ہونے لگی، پھر پتنگ پر بنے گول دائرے دیکھتے ہوئے ہم بھی گول ہو گئے یعنی کہ بے ہوش ہو گئے۔ جب ہوش آیا تو پاؤں پر پٹّی بندھی ہوئی تھی، گھر والے قریب بیٹھے تھے ہمیں ہوش میں آتا دیکھ کر خوش ہو گئے۔ ہمیں پھر پتنگ یاد آئی، جب ہم نے پوچھا تو ہمیں زبردست ڈانٹ پڑی کہ ہم مرتے مرتے بچے ہیں، ایک پتنگ کے لئے آج آئینہ ہمیں مات دے گیا تھا۔۔۔!

--

-٠- -٠- -٠-

"موسموں کا مزاج"

ہمیں موسموں کا مزاج بالکل بدلا ہوا سا لگنے لگا ہے ......
غلط فہمی کا شکار ہم ہرگز نہیں ہیں، بلکہ "ہمی" کا شکار کرتے کرتے ہماری عمر گذر جانے پر تُلی ہے، ہم آپ کو موسم کے "بدلتے مزاج" کا ثبوت دیں گے تب تو آپ کو یقین آئے گا نا!

ایک دفعہ ہم اپنے کمرے میں بیٹھے کچھ "لکھا پڑھی" کر رہے تھے، کھڑکی سے باہر نظر دوڑائی تو نظارا کافی دلکش تھا۔ ابر آلود آسماں سے ننھی سی بوندیں زمین پر "چھم چھم" گر رہی تھیں۔ بالکل اُسی طرح جیسے دو، چار ماہ کا بچہ سوئی ہوئی ماں پر گرتے اور اُٹھتے رہنے کا کھیل کھیلتا ہے۔ ماں جاگی ہوئی رہنے کے باوجود بھی سوئی سی رہتی ہے۔ ہماری یہ زمین بھی تو ماں ہی ہے نا! اِس لئے وہ اس ننھی مُنّی بوندوں کی اُچھل کود سے مسرور رہتی ہے، ہمیں ایسے منظر بہت اچھے لگتے ہیں اور ہمارا موڈ بالکل شاعرانہ ہو جاتا ہے اور ہم اپنے قلم کو "شُترِ بے مہار" کی طرح اپنے ہاتھوں میں دے کر بیٹھ جاتے ہیں .....

ہاں تو ہم نے اس دفعہ بھی ایسے ہی کیا مگر صفحات پر سیاہی پھیلتی نظر آئی۔ ارے، یہ کیا؟ یہ ننھی سی بوندیں ہمارے صفحات پر کیسے گرنے لگیں؟ ہم نے سر اُٹھا کر اُس چھت کی طرف دیکھا جس کے نیچے ہم بے تکلف بیٹھے ہوئے تھے

چھت تو بالکل ٹھیک ٹھاک تھی تو پھر یہ قطرے کہاں سے ٹپک رہے تھے۔ کہیں
ہماری آنکھیں شاعری میں بہائے جانے والے اشکِ غم سے لبریز تو نہیں ہوگئیں؟
ہم نے ماہر سی آئی ڈی آفیسر کی طرح چھان بین شروع کی۔ ہم نے آخر وہیں بیٹھے
بیٹھے اِن بوندوں کا سراغ پا ہی لیا، یہ بوندیں بارش کی بوندیں تھیں اور نہ ہی
"دیدۂ تر" کی بوندیں تھیں بلکہ یہ ہماری "جبینِ عرق آلودہ" کا کارنامہ تھا، ہم
پریشان ہوگئے کہ اس ٹھنڈے اور گیلے موسم میں ہم اتنے پسینے میں شرابور کیسے
ہوگئے؟ ہم نے پھر اُس خوبصورت نظارے کو دیکھنے کے لئے باہر نظر دوڑائی تو وہاں
اب تو موسلا دھار بارش شروع ہوچکی تھی۔ پانی کی بڑی بڑی سلسلہ وار بوندوں
نے ننھی سی بوندوں کو صفحۂ منظر سے ہٹا ڈالا تھا۔ تیز بارش، ہوا کے دباؤ میں کمی
یہی وجہ تھی جو ہم پسینہ میں نہا گئے تھے۔

ایک دفعہ ایک اور عجیب واقعہ ہوا۔ گرمی کا زور تھا، سورج پورے جاہ
وجلال کے ساتھ جلوہ گر تھا، کسی کم بخت کی مجال نہ تھی کہ نظر اُٹھا سکے۔ ہم
نے کڑی دوپہر میں اپنا "سوئٹر" تلاش کرکے پہن لیا، اوپر سے گرم شال
بھی اوڑھ لی۔ ہمارے سرتاج نے ہمیں شک کی نگاہوں سے دیکھتے ہوئے پوچھا
یہ کیا پاگل پن ہے؟ ہم نے دانت بجاتے ہوئے بہ مشکل جواب دیا کہ سردی
ہورہی ہے۔ سردی ہورہی ہے؟ وہ حیران رہ گئے، پھر کہا پاگل پن
کے بارے میں سنا تو تھا، آج دیکھ بھی لیا، چلچلاتی دھوپ میں یہ گرم کپڑے
سبحان اللہ۔۔۔۔ ہم نے اپنے برف کی طرح ٹھنڈے ہاتھوں سے اُن کے
ہاتھ چھوتے ہوئے کہا، بخدا ہم جھوٹ نہیں کہہ رہے ہیں، دیکھئے ہماری حالت!

اُنھوں نے پوچھا، کیا تم نے آئسکریم زیادہ کھالی تھی؟ ہم آئسکریم کا نام سنتے ہی اور بھی کانپنے لگے اور گھڑی کی طرح بلانکٹ اوڑھ کر سو گئے۔ سہ پہر تک ہم "نارمل" ہو چکے تھے۔ بعد میں معلوم ہوا کہ وہ ملیریا کا اٹیک تھا۔

ایک اتفاق ایسا بھی ہوا کہ جب موسم سرما نے کُہر کی چادر میں سارے شہر کو لپیٹ لیا تھا تو ہم آدھی رات کو بے قرار ہو کر اُٹھے اور پنکھا کھول دیا۔ ہم وحشت زدہ ہو کر پسینہ پوچھنے لگے تھے مگر خدا جانے کیا ہو گیا تھا کہ پسینہ نکلتا ہی جا رہا تھا، بال بھیگ گئے، کپڑے بھیگ گئے، یہاں تک کہ ہم جس تکیہ پر لیٹے تھے وہ بھی گیلا ہو گیا، پنکھے کو کھُلا دیکھ کر ہمارے سرتاج نے ہمیں ڈانٹا، یہ کیا ہے؟ بند کرو پنکھا، کیا مرنے کا ارادہ ہے؟ ہم نے ہانپتے ہوئے کہا، ارے ہوا زندگی کی پہلی ضرورت ہے اور ہم زندہ رہنے کے لئے ہی تو ہوا لے رہے ہیں، یہ دیکھئے! وہ پریشان ہو کر بولے کیا نہا کر نکلی ہو؟ ہم نے انکار میں سر ہلایا تو اُنھوں نے پوچھا، طبیعت کیسی ہے؟ ہم نے اپنے آپ کو آگے کرتے ہوئے کہا، دیکھئے! بس ایسی ہے، باتوں کی وجہ ذہن اپنی طرف سے ہٹا تو پسینہ رُکنے لگا، رفتہ رفتہ ہم پھر اصلی حالت میں آگئے۔ . . . . .

بعد میں پتہ چلا کہ برسوں بعد جو ہمیں بخار آیا تھا اُس کم بخت نے اِس سردی میں آدھی رات کو اُترنے کی منت مانی تھی، اب آپ ہی بتائیے، اِن حالات میں اگر ہم یہ دعویٰ کرتے ہیں کہ "موسموں کا مزاج" بدل گیا ہے تو کیا یہ غلط ہے؟ کہئے نا ؟ ؟ ؟ ؟

--

-○- -○- -○-

"ایک شام ہماری بھی"

ہوا کچھ ایسا کہ ایک شعری مجموعہ ہم سے سرزد ہو گیا۔ بس! پھر کیا تھا؟ "محفلِ خواتین" نے ہمارے خوشی کے ایک "تقریبِ اجراء" منا ڈالی اور وہ بھی کچھ اس طرح کہ ہم بوکھلا سے گئے۔ بڑی بڑی نامور ادیب و خواتین و شاعرات کو بلایا گیا کہ وہ ہم پر، ہمارے کلام پر روشنی ڈالیں (یہ اور بات ہے کہ ہم پر زیادہ روشنی کیمرہ مین اور ویڈیو گرافر ڈال رہے تھے) اس محفل کی کنوینر تھیں ڈاکٹر صابرہ سعید، پہلے گلپوشی طے پائی۔ تمام مہمانوں کو پھولوں کے ہار پہنائے گئے۔ پھر ناچیز کے گلے میں بھی کئی ہار ڈالے گئے جن میں دوستوں کے ہار بھی شامل تھے۔ وہ تو کہئے کہ خیر ہوئی، ورنہ ہم کسی کمزور سے گلدان کی طرح گر پڑے ہوتے۔ پھر پھولوں کا سلسلہ ختم ہوا تو مجموعہ کلام "اب کے برس" کے چہرے سے نقاب ہٹائی گئی۔ بخدا دنیا میں سب سے زیادہ یہی کتاب ہم کو اچھی لگی۔ یہ ہماری اپنی کتاب تھی جسے ہم بڑی عقیدت سے دیکھ رہے تھے کیونکہ یہ کتاب ہمارا نیا جنم تھا۔ ہم نے بڑی بڑی سانسیں لیں اور ضبط کے خوگر بنے بیٹھے رہے ورنہ جی چاہ رہا تھا کہ آدابِ محفل بالائے طاق رکھ کر ہم وہ زوردار تالیاں بجائیں جو دلی خوشی کا اظہار کرتی ہیں۔

ہم سب ہی کے منہ سے پھول جھڑتے دیکھتے رہے۔ کبھی کبھی ہم پر تارے بھی ٹوٹے بغیر گرتے رہے اور ہم اُجالوں میں بھیگتے رہے۔ ہم اپنے آپ کو بے حد شرمندہ محسوس

کر رہے تھے کیونکہ حاضرینِ محفل کی نظریں ہم پر لگی تھیں اور معتزین نے ہم سے کافی اُمیدیں وابستہ کرتے ہوئے ہمارے نام کے پرچم اپنے لفظوں کے پیرہن میں لہرا دیئے تھے۔

کم بخت کیمرے کی آنکھ ہم سے مسلسل آنکھیں لڑا رہی تھی۔ ہم اپنے دائیں بائیں بیٹھی معزز ہستیوں کو چور نظروں سے دیکھ رہے تھے۔ ایسی شخصیتوں کے ساتھ بیٹھنا کوئی معمولی بات نہیں جن کے نام کے ڈنکے بجتے رہتے ہیں۔ اس طرح کی ادبی محفلوں میں ہم وجود سے "حاضر" ہوتے ہوئے بھی ذات سے اکثر "غائب" ہو جاتے ہیں اور اس وقت بھی ایسا ہی تھا۔ ہمارے اندر کا موسم بدلتا ہی جا رہا تھا۔ کبھی احساسِ کمتری کی سرد لہر ہم میں دوڑ جاتی تو کبھی محبت بھرے جملے سن کر حیات کی گرم لہر ہمارے وجود کے اندر بگولوں کی طرح اُٹھ جاتی۔

غرض کہ اس یادگار شام کو ہم کبھی نہ بھلا پائیں گے۔ بیگم ہاشم علی اختر، بیگم انیس حسن الدین صاحبہ، محترمہ سلطانہ شرف الدین، محترمہ فاطمہ عالم علی خاں، محترمہ نایاب سلطانہ، پدم شری محترمہ شریف النساء، محترمہ آمنہ حیدر خاں، محترمہ قادری بیگم، محترمہ پروفیسر رفیعہ سلطانہ صاحبہ، محترمہ آر۔ بانو صاحبہ، ڈاکٹر بانو طاہرہ سعید صاحبہ، محترمہ اقبال جہاں قدیر، منظر النساء ناز، نرجلی، عالیہ خان، رضیہ سلطانہ شاہین بیگم نواب اقبال علی خاں جیسی شخصیتوں کے علاوہ کئی اور خواتین بھی موجود تھیں۔ جلسے کے اختتام پر کچھ اجنبی خواتین جانے لگیں۔ کچھ ہمیں مبارکباد دینے لگیں۔ کسی نے ہمیں گلے لگایا، کسی نے دعا دی، کسی نے ہاتھ ملایا۔ بہرحال ہم "صاحبِ کتاب" تسلیم کر لئے گئے۔

ہم ابتداء میں بوکھلائے ہوئے تھے مگر محفل جب رنگ پر آ گئی تو دل ہی دل میں اپنے آپ کو شاباشی دی کہ واقعی ہم نے بڑا کارنامہ انجام دیا ہے۔ ہم اپنے اس پہلے تجربے کی کامیابی پر اتنے خوش تھے جیسے کہ پہلی بار ایٹم بم بنا کر اہلِ مغرب مسرور ہوئے تھے، یاد ہے نا؟

"موسمِ گرما اور ہم"

آسمان کی گرفت نہ جانے کیوں آج کل سورج پر اتنی کمزور ہو گئی ہے کہ سورج آسمان کی ہتھیلی میں چمکنے کے بجائے ہمارے سروں پر آ گیا ہے۔ ہر چند کہ "سوا نیزے" پر نہیں لیکن ہمیں تو لگتا ہے کہ ہمارے سر پر ہی آج کل طلوعِ آفتاب ہو رہا ہے۔ ہم اکثر شہر کے بھرے پڑے علاقے سے گزرتے رہتے ہیں۔ ہمیں اپنے شہر کی پکی سڑکیں فولادی لگتی ہیں۔ ان کی تپش آنے جانے والے راہگیروں کے چہروں سے عیاں ہوتی رہتی ہے۔ سڑک کے ہر طرف خوش رنگ شربتوں کے گلاس اور خوش شکل تراشے ہوئے پھل خواہ مخواہ نگاہوں میں "زیدہ پن" پیدا کرتے ہیں۔ کبھی کسی کے ہاتھ میں آئسکریم نظر آتی ہے تو ہماری بھی رال ٹپک پڑتی ہے۔ مگر ہم کیا کریں کہ ہمیں سڑکوں پر نہ کھانے کی عادت ہے نہ ٹھہرنے کی۔ یہ سب تو ہم آتے جاتے دیکھتے رہتے ہیں۔ آسمان کا ستم ڈھانا یوں بھی شاعروں کے لئے نیا نہیں۔ آسمان "دو آتشہ" ہو جاتا ہے تو بے چاری ہوائیں بھی اپنی ٹھنڈک اس آسمان کے سائے میں کھو بیٹھتی ہیں۔ گرم لو کے جھکڑ والے لبادے پہنی یہ ہوائیں اپنی خوش خرامی بھول کر "بگولہ" بن جاتی ہیں۔

ہم نے کئی بار چاہا کہ تپتی دھوپ میں شہنشاہِ فلک کو اک نظر دیکھ لیں۔ وہ کیوں جلنے لگا ہے؟ آخر ہم اہلِ زمیں سے ایسی کیا خطا سرزد ہوئی کہ اس کا

غصہ کم نہیں ہوتا۔ لیکن ہم نے جب بھی آنکھ اُٹھا کر آفتاب کو دیکھنے کی کوشش کی، لگا کہ ہماری آنکھوں میں گرم گرم لاوا گرنے لگا ہے۔ ہم نے سیاہ چشمہ آنکھوں پر چڑھالیا اور لگے شیشے کی دیوار کے پیچھے سے نظارہ کرنے۔ لیکن نقشہ بدل چکا تھا۔ دھوپ کے منظر چھاؤں دینے لگے۔ ہم نے شوخی میں آکر یوں ہی ننگے پاؤں چلنے کی کوشش کی...... اُف! شائد ہم پاگل ہو گئے تھے۔ بھلا "انگاروں" پر کہیں ہم جیسے لوگ چل سکتے ہیں بھلا .....؟ آگ کے دریا ہم جیسوں سے قطعی پار نہیں ہو سکتے، بالکل نہیں ....!

ہم نے موسم گرما میں ہر سڑک پر چلنے والے کو دیکھا ہے کسی کے چہرے پر وہ آثار پائے نہیں جاتے جو اُسے انسان ثابت کر سکے۔ بس! اک عالم وحشت چہروں پر طاری ہے۔ ہر شخص دھوپ سے بچنا چاہتا ہے۔ ہر شخص جلد سے جلد دہکتے ماحول سے گذر جانا چاہتا ہے۔ پتہ نہیں کیوں ہمیں ایسی خواہش ہوتی ہے کہ اس دھوپ سے بچنے کے لئے اگر ایک آدمی دوسرے آدمی کی چھاؤں میں چلنے لگے تو...... گرمی کا احساس بھی کم ہوگا اور اپنے ہمسفر کی شناخت بھی ہو جائے گی، مگر لوگ یہ بات نہیں سمجھتے۔ ایک دوسرے کو دھکیلتے ہوئے آگے بڑھ جاتے ہیں۔ پگھلتے ہوئے انسانوں کا دل خدا جانے کیوں نہیں پگھلتا؟۔

وہ رک کر، ذرا دیر ٹھہر کر پیاس کے کنارے دو گھونٹ "اخلاق" پی کر کیوں نہیں چلتے؟ انھیں شہنشاہِ فلک کے دربار میں پگھلنا تو آتا ہے مگر پگھلنے کے بعد بھی محبت کا سرچشمہ نہیں ہو پاتے، خدا جانے کیوں؟ ..... نہ جانے کیوں؟

ہمارا خیال ہے کہ موسم کی تمازت سہنے کے لئے نہیں بلکہ ایک دوسرے کی ضرورت کو سمجھنے کی ہمت چاہیئے۔ اُن لوگوں کو بھی چھاؤں کی ضرورت ہے جو جلد چل نہیں سکتے۔ آگ کے دریا سے گذر نہیں سکتے۔ ٹھہر جانے کے باوجود کوئی ان کی پیاس نہیں بجھاتا۔ آسمان بھی نہیں۔

اُفوہ! ہم اِس غور و فکر کے سمندر میں غوطے کھا ہی رہے تھے کہ ہمیں احساس ہوا کہ ہمارے سر پر "طلوعِ آفتاب" ہو رہا ہے، نہ صرف یہ بلکہ آگ کا ٹھاٹیں مارتا سمندر بھی ہماری قدم بوسی کر رہا ہے، ہم بے چین ہو گئے۔ بات یہ تھی کہ ہم اپنے خیالوں میں رہے۔ ہمارا آٹو والا آٹو رکشا کڑی دھوپ میں ٹھہرا کر شربت پینے اُس پار چلا گیا۔ آٹو کی چھت دہک رہی تھی، آٹو کا فرش سلگ رہا تھا۔ ہمیں یاد آیا کہ ابھی کچھ دن پہلے کیسا ٹھنڈا موسم تھا، ہمارے ہاتھ پاؤں برف کی مانند رہتے تھے۔ ہم سوئٹر کے علاوہ گرم شال اپنے شانوں پر ڈالے دانت بجاتے پھرتے تھے۔

ہم موسمِ سرما میں کافی "کم گو" ہو جاتے ہیں۔ بات کرنے کیلئے منہ کھولنا پڑتا ہے اور منہ کھلتے ہی فضا کی سردی ہمارے لہجے کو سرد کر دیتی ہے جس سے ہمارے "گھریلو معاملات" کئی بار "بگڑتے اور بنتے" رہتے ہیں۔ گرم کپڑے اور گرما گرم چائے کے مزے لیتے ہوئے ہم کڑاکے کی سردی میں گرمیوں کے طلب گار ہوتے ہیں اور جب موسمِ گرما آتا ہے تو ہم گھبرا جاتے ہیں۔ ضرورت سے بھی زیادہ ۔!!!

--

○

ہم نے بھی عید منائی

آپ چاہے عید کسی طرح منائیں لیکن ہم نے عید کس طرح منائی ذرا یہ تو سُنیئے ......

بادام، کشمش، کاجو، چرونجی، پستے اور کھجور کے اونچے اونچے پہاڑوں کے درمیاں سیویوں کے ڈھیر پر بیٹھے ہم دودھ کے تالاب میں مسری کی ڈلیاں یوں ہی پھینکتے جا رہے تھے۔ ہمیں خیال ہوا کہ "ذرا دور اُس موڑ پر" ایک اور تالاب سا نظر آرہا ہے، ہم وہاں پہنچے تو بس روح جھوم ہی تو گئی۔ یہاں ایک نہیں، کئی تالاب تھے، خوشبو سے بھرے ان چشموں میں وہی پھول ہمیں نظر آئے جن سے یہ چشمے بھرے تھے، کہیں گلاب کا چشمہ، کہیں موتیا کا چشمہ، کہیں خس اور کہیں رات کی رانی، ہائے! ہم نے تو سوچا بھی نہیں تھا کہ ہمارا مقدر اس طرح چمکے گا، ہم تو چھپاک، چھپاک ایک ایک چشمے میں ہاتھ مارتے جا رہے تھے، مارے خوشی کے ہم یہ بھول ہی گئے کہ ہمیں عید منانی ہے یعنی سب سے پہلے جو عید کا دستور ہے "نئے کپڑے" ہم نے اپنے کپڑوں کی طرف دھیان ہی نہیں دیا لیکن اتنا ضرور یاد تھا کہ درزی اگر مائل بہ کرم ہو تو خوشی کی بات ہے۔ اگر کپڑے نہ سلے ہوں تو ہم کیا کر سکتے ہیں بس، یہی کہ عید نہ منا سکیں گے "ہلالِ عید کو ہماری ہنسی اڑانے

دیجیئے ۔ ۔ ۔ ۔ بھلا ہم کر ہی کیا سکتے ہیں، خیر، پھر ہم اُس معزیات کی وادی میں دوبارہ پہنچ گئے جہاں لذتِ کام و دہن کے گلستاں ہی گلستاں تھے۔ ہم نے سوچا کہ سیویوں کے ڈھیر سے ذرا اور آگے دیکھیں شائد کچھ اور حسین نظارا ہو، لوگ تو ستاروں سے آگے بھی چلے جاتے ہیں نا ؟ ہم آگے بڑھے، واقعی ہم سوچ بھی نہیں سکتے تھے وہ نظارہ ہماری آنکھوں کے سامنے تھا۔ چھوٹے چھوٹے اصلی گھی کے حوض جن کے فواروں سے گرم گرم اور تازہ خوشبودار گھی اُبل رہا تھا۔ کچھ زردی مائل حوض بھی تھے جن میں زعفرانی شیرہ بھرا ہوا تھا، ہائے! ہم کیا کریں ؟ ہم بڑے ندیدے ہو چلے تھے، ہم معزیات کی اس وادی میں کیسے آئے یہ تو خبر نہیں لیکن اب یہ جگہ چھوڑ کر جانے کے لئے ہم ہرگز تیار نہ تھے۔ دفعتاً ہماری نظر اُس عجیب وضع کے چھوٹے سے ٹیلے پر پڑی جو بے حد سبز تھا، ہم قریب پہنچے تو اُف، کیا بیان کریں، واہ واہ، پان کی خوشبودار گلوریوں سے بنا ہوا یہ ننھا سا پہاڑ ہم پر مسکرا رہا تھا، عطر کے چشموں میں چھپا کے مارنے کے بعد ہمارا دل بھی بھٹکنے لگا تھا، ذہن و قلب میں شیریں، تخیلات کی یلغار تھی اور مغل دور کی شہزادیوں کے نقشِ قدم پر چلنے کی ترغیب دینے والا یہ پان کی گلوریوں کا پہاڑ ہمیں اپنے پاس بُلا رہا تھا۔ ہائے قربان، خدا جانے یہ سب ہماری کس نیکی کا انعام تھا، ہم مگن ہو گئے۔ ذرا بھٹکنے لگے، پھر ایک جست لگائی عطر کے چشموں کی طرف ۔۔۔

خادمہ کی چیخ سنائی دی اور ہم آگئے ہوش میں، عید کی تیاری میں

مصروف ہم شیر خُرمہ بنانے سے پہلے بڑی سی بالٹی کا دودھ بڑے دیگچے میں ڈالتے ہوئے عالمِ تصور میں کھو گئے تھے۔ جب ہمارے تصور نے ہمیں عطر کے چشمے میں دھکّا دیا تو ہم سچ مچ دودھ کے بڑے دیگچے میں چھپاک، چھپاک ہاتھ مارنے لگے تھے، دودھ اُچھل رہا تھا اور ہم دودھ کی بارش میں بھیگ رہے تھے۔ ہمارے نئے کپڑے لگتا تھا کہ کسی قدیم میوزیم سے لائے گئے ہوں جو اُس زمانے کے دربار میں کسی فقیر کو بھیک میں دیئے گئے تھے، عید کے مبارک موقع پر ...! اور شائد اس دور کے سلطان نے اُسے اپنی پوشاک بخشش دے کر اُس کے لباس کو بطورِ یادگار اپنے پاس محفوظ کرلیا تھا، حالانکہ یہ ہمارا عید کا بالکل نیا اور شاندار لباس تھا جسے ہم نے اپنی "خیالی لہر" سے برباد کرلیا تھا۔ عطر کے چشموں کا خیال آنے کے بعد ہوش تو یوں ہی جاتے رہتے ہیں نا ؟

-o- -o- -o-

"لب ڈب"

لب ڈب! لب ڈب! لب ڈب!! ......

جی نہیں! ہم بکواس بالکل نہیں کر رہے ہیں ہم تو آپ کو معمول کے مطابق دل کی آواز سنا رہے ہیں جو ہمارے بھاری بھرکم وجود کے اندر گونج رہی ہے بالکل جرس کی طرح، اور کاروانِ حیات رواں دواں ہے... ہم اس کارواں کو روک نہیں سکتے، ہم خود اس کے ساتھ چلتے ہیں، ہمارے قدموں کی آہٹ بھی لب ڈب، لب ڈب کی لَے سے میل کھاتی ہے اتفاقاً کبھی ایسا بھی ہوتا ہے کہ قدموں کی لڑکھڑاہٹ دل میں لب ڈب کی آواز کو ذرا بے ہنگم کر دیتی ہے، تارِ حیات جھنجھنا اُٹھتا ہے اور ہم اپنے اندر ارتعاش محسوس کرتے ہیں۔ رفتہ رفتہ ہم معمول کے مطابق ہو جاتے ہیں لیکن اُس وقت "صدائے لب ڈب" پھر بے ترتیب ہو جاتی ہے جب ہم مشاعروں کے بارے میں پڑھتے اور سنتے ہیں۔ اس دورِ حاضر نے غیر شاعرانہ ماحول میں بھی مشاعرے منعقد کرنے کی ٹھان رکھی ہے۔ پندرہ تا بیس افراد کی تعداد میں بھی مشاعرے ہونے لگے ہیں جن میں سے آدھے شاعر اور آدھے سامعین ہوتے ہیں، بڑے بڑے مشاعروں کی بات اور ہے مگر وہاں بھی اب باذوق کم اور بد ذوق زیادہ پائے جانے لگے ہیں۔ ہم ایک مرتبہ کسی مشاعرہ میں شریک تھے، سامعین کو اصرار

تھا کہ اس مشاعرہ کو دوبارہ پڑھایا جائے جو محفل گرما گئی تھی، انتظامیہ کے لوگ اس کے حق میں نہیں تھے، بہرحال جونہی مشاعرہ ختم ہونے کا اعلان ہوا سامعین نے پتھراؤ شروع کر دیا، کافی ہنگامہ ہوا، پھر پولیس آئی۔ کسی طرح حالات پر قابو پا لیا گیا۔ ہم جب تک شریکِ مشاعرہ رہے ہمارا دل لب ڈب لب ڈب، کرتا رہا۔ لیکن یہ ہنگامہ آرائی کے بعد تو لیا لب، ڈبا ڈب وغیرہ، وغیرہ کرنے لگ گیا اور بھی نہ جانے کتنے دلوں کی دھڑکن بے ترتیب ہوئی، کتنے لوگوں کا ہارٹ فیل ہوتے ہوتے بچا، یہ تو ہم نہیں جانتے، ہاں اندازہ ضرور کر سکتے ہیں کیونکہ ہمارے ساتھ ہماری ایک شاعرہ دوست کی حالت نے ہمیں حواس باختہ کر دیا تھا، وہ بے چاری پتھراؤ کیا جانیں، مجنوں کا دور تو رہا نہیں، انھیں معلوم نہیں تھا کہ پتھراؤ سے کیسے بچنا چاہیئے؟ وہ گھبرا گئیں جسم لرزنے لگا، پسینہ میں شرابور ہو گئیں، آواز بند اور ہونٹ خشک ہو گئے اشارے سے ہمارا ہاتھ لے کر اپنے سینے پر رکھا جہاں ہمیں زلزلے کا احساس ہوا کیونکہ زلزلہ سے زمین کے اندر کی پرت باہر الٹ آتی ہے۔ ہم گھبرائے کہ کہیں ان کا دل نہ باہر نکل آئے کیونکہ وہاں لب ڈب کے بجائے دھڑام، دھڑام ہو رہی تھی، ہم انھیں کسی طرح گھسیٹ کر کار تک لے آئے اور انھوں نے اپنے آپ کو گاڑی کی سیٹ پر یوں گرا دیا کہ ہم تو سمجھے خدا نخواستہ ......

ان کی صاحبزادی چلائے جا رہی تھیں حالانکہ خطرہ ٹل چکا تھا مگر صاحبزادی کی چیخوں کا سائرن جاری تھا۔ بڑی مشکل سے ہم نے ان کے منہ پر ہاتھ رکھ کر دبا دیا، اور اپنے بازو سیٹ پر بٹھا لیا پھر ان کو ان کے گھر چھوڑتے ہوئے

ہم واپس چلے آئے ....

بڑے مشاعروں میں کبھی ایسا ہو ہی جاتا ہے۔ کسی کونے سے نعروں
یا سیٹی کی گونج عام بات ہے لیکن چھوٹے مشاعروں میں ایسے اثرات کم
ہوتے ہیں۔ اُردو کی بقاء کے لئے جلسے' مشاعرے' سیمینار کا رواج عام ہو گیا ہے
لیکن بدذوق سامعین کی کس طرحِ اصلاح کی جائے؟ سمجھ میں نہیں آتا۔ ہمارا خیال
ہے کہ ایسا کوئی دستور بنایا جائے کہ مشاعرے میں شرکت سے پہلے ہر شخص کو کارڈیالوجسٹ
سے معائنہ کروا کر آنا چاہیئے کیونکہ لب ڈب تک تو معاملہ ٹھیک ہے۔ سمجھ لیجئے کہ صاحبِ ذوق
ہیں اور دل کی آواز بالکل نارمل ہے۔ اگر بے ترتیب لگے تو اُنھیں اپنی ای۔ سی۔ جی رپورٹ
پہلے منتظمین کے پاس بھجوانی ہوگی۔ اگر وہ پاس کردیں تو شرکت ہو سکے گی ورنہ نہیں۔
منتظمین میں خاص طور پر ایک "ماہرِ دل" ڈاکٹر ہونا ضروری ہے۔ شاعروں کے دل میں
یوں بھی مشاعرے ہوتے ہی رہتے ہیں لیکن وہاں پتھراؤ نہیں ہوتا اور نہ "لب ڈب"
جیسی کوئی آواز ہوتی ہے فقط شاعر کی آواز ہوتی ہے یہ لب ڈب تو اُن کی نظر میں
واہمہ ہے ان کے پاس دل کی اہمیت ہے دل کی آواز کی نہیں لیکن اس دور میں دل
کی آواز بڑی اہمیت رکھتی ہے اس سے رفتارِ زندگی کا اندازہ ہوتا ہے اور گردشِ
ایام کا بھی، ڈاکٹروں کا بھی یہی دعویٰ ہے کہ لب ڈب، لب ڈب، اگر ہوتی رہے
تو سمجھ لیجئے دل کے حالات بڑے سازگار ہیں۔ اگر یہ لبا لب، لبا لب ہو تو پھر سمجھ
لیجئے دل کے حالات بڑے سازگار ہیں اگر یہ لبا لب، لبا لب ہو تو پھر سمجھ لیجئے سنگینیٔ حالات
کی مے سے ساغرِ دل بھر چکا ہے اور چھلکنے ہی والا ہے ..... تو اس سے پہلے کہ ہمارے
دل سے کوئی چیخ سی گونجے، کوئی شور سا اُٹھے ـــــ ہم آپ سے اجازت چاہتے ہیں
لب ڈب، لب ڈب! لب ڈب! .....

"دورِ زماں ہمارا"

کچھ بات ہے کہ ہستی مٹتی نہیں ہماری
صدیوں رہا ہے دشمن دورِ زماں ہمارا

ہاں ...... ! کیا یہ سچ نہیں کہ زمانہ ہم خواتین کا زمانے سے دشمن ہے؟ حالانکہ خواتین ہی کی بدولت زمانے میں رونق ہے۔ اگر ہم خواتین نہ ہوں تو یہ "زمانہ" بھی اپنا بوریہ بستر گول کر جائے گا ...... ہے نا!

مثال کے طور پر سب سے پہلے گھر کے ماحول کو ہی لیجئے۔ وہ گھر، گھر ہی کہاں ہوتا ہے جہاں "خاتون" جیسی کوئی ہستی نہ ہو۔ دُنیا بھر کی بدنظمی اُس "چہار دیواری" میں نظر آتی ہے۔ صاحب کے میلے کپڑے بکھرے ہوئے، ایک پاؤں کا جوتا، دوسرے پاؤں کی چپل، پُرشکن بستر کے پاس ہی پائے جاتے ہیں۔ (کیوں؟ یہ آپ سمجھے نا!) چائے کی پیالی طشتری سے کافی دور جس میں "تلچھٹ" بھی ہوتی ہے "تغافل" کا رونا روتی نظر آتی ہے۔ پُرانے اخبارات کے ڈھیر پر "منوں" دھول بھی "صحافت" کا ماتم کرتی نظر آتی ہے۔ اگر صاحب عام آدمی ہوں تو ...... اور اگر خیر سے شاعر یا ادیب ہوں تو پوچھنا ہی کیا، سارا نجانہ خراب ہوتا ہے، بے سرو سامانی، قافیہ تنگ ہونے کا اعلان کرتی ہے ٹوٹے پھوٹے قلم اور کچھ ادھوری تحریروں کے بوسیدہ صفحات اس لائبریری کی

یاد دلاتے ہیں جو ناقدری کا صدیوں سے سامنا کرتی آئی ہو . . . . . . !
کچھ اخباروں، رسالوں کے تراشے اور ماضی کی دھندلائی ہوئی تصویریں بھی منہ چڑاتی نظر آتی ہیں۔ دیواروں پر رنگ و روغن تو نہیں رہتا البتہ کچھ ناموں کے ساتھ کچھ جملے۔ مثلاً . . . . . . "کے نام" . . . . . . "کے نام" . . . . . "کے لئے" . . . . . "کے بغیر" وغیرہ وغیرہ . . . . . کچھ انجانے خطوط بھی ٹوٹی پھوٹی میز پر پائے جاتے ہیں جن میں "ناقابل اعتبار" باتیں بڑے اہتمام سے لکھی ہوتی ہیں۔ شاعر و ادیب حساس ہوتے ہیں نا! اس لئے ان کے پاس کتابیں ان کی ہوں یا کسی اور کی اس میں "تتلیوں کے پر" اور سوکھے ہوئے پھول تو یقیناً مل جاتے ہیں۔ اگر صاحب "ملازمِ سرکار ہوں تو چمکیلے جوتے اور استری کئے ہوئے کپڑے نامکمل ہینگروں پر نظر آہی جاتے ہیں، زیادہ تر ان کی میز پر ایسے کاغذ ہوتے ہیں جن پر مختلف حسابات لکھے ہوتے ہیں، ان کے لئے ہر روز "روزِ حساب" ہوتا ہے۔ ایک ٹائم پیس ان کے جھولے نما پلنگ کے پاس ضرور ملے گی جو انھیں اپنے "کرخت الارم" سے سویرے جگانے کا کام کرتی ہے۔ ایک جھاڑو بھی پلنگ کے نیچے آپ کو ملے گی جو کبھی چھٹی کے دن صاحب گھر کی صفائی کے لئے استعمال کرتے ہیں۔ حمام میں ایک بالٹی میں کپڑے ضرور بہ ضرور بھگوئے ہوئے رکھے ہوتے ہیں۔

خیر! اب صاحبوں کی کئی قسمیں ہیں، کتنی گنوائیں؟ اب اگر عام جیسے صاحب ہوں اور ان کے گھر میں خاتون ہو تو چائے کی پیالی طشتری سلیقے سے رکھی نظر آئے گی، جوتا جوتے کے ساتھ اور چپل، چپل کے ساتھ ہی ملیں گے۔ پرانے اخبارات ترتیب سے رکھے ہوئے ملیں گے جس پر دھول بھی کم سے کم نظر آئے گی

بستر پر شکن تو قطعاً نظر نہیں آتی۔ تکیہ کے غلاف پر پھول بھی یقیناً بنے ہوتے ہیں، ہے نا؟

شاعر و ادیب کے گھر میں ٹوٹے ہوئے قلم نہیں، تلوار کی طرح چلنے والے قلم ملیں گے بشرطیکہ "خاتون" موجود ہو۔ اخباروں، رسالوں کے تراشے فائل میں لگے ہوں گے مگر انجانے خطوں کا میز پر پایا جانا ممکن نہیں، بھلا ناقابل اعتبار تحریروں پر کہیں اعتبار کیا جا سکتا ہے ....؟ کتابوں میں رکھی تتلیوں، پھولوں میں اضافہ ہی ہوتا ہے، کمی نہیں ہوتی۔

اگر ملازم سرکار صاحب بھی "صاحب خاتون" ہوں تو نقشہ وہی رہے گا بہت کم تبدیلی نظر آئے گی کیونکہ خاتون بھی شانہ بہ شانہ صاحب کے ساتھ دفتر جاتی ہے نا، اور دفتر کے نظام کو درہم برہم ہونے سے ہمیشہ بچانے کی کوشش میں خود کو الجھائے رکھتی ہے۔ مگر خدا معلوم آج کل ماحول میں خواتین سے "تعصب" کیوں اتنا بڑھ گیا ہے کہ اس کی اہمیت کو "صاحبان" گھٹانے کی کوشش میں خود اپنی قدریں گھٹائے جا رہے ہیں، قدر تو ساتھ دینے سے بڑھتی ہے "انجان ہونے سے نہیں۔ خواتین "نظام عالم" کا سب سے اہم دستور ہیں جس کی اہمیت سے صاحبان لاکھ انکار کریں مگر حالات شاہد ہیں ؎

زندگی کے خالق ہم، زندگی کے مالک ہم
ہم نے اپنے سانچے میں زندگی کو ڈھالا ہے

ہے نا ــــــ!

-۰- -۰- -۰-

"ہنستے رہیئے"

اب اتنا زیادہ بھی ہنسنے کی ضرورت نہیں کہ آپ ہر وقت منجنِ فاروقی کا اشتہار نظر آنے لگیں۔ ہم نے یہ مشورہ اس لئے دیا ہے کہ آج کل ہنسنا معیوب سمجھا جانے لگا ہے۔ خاموش رہنا یا منہ بسورتے رہنا فیشن ہے، مسکراہٹ بھی شاذ و نادر ہی گوارا کی جاتی ہے۔ خوش اخلاقیوں کے موسم گذر گئے، اب آیا ہے صرف "جلے منہ" رہنے کا دور...... مگر ہم اس دیش کے واسی ہیں جس دیش میں گنگا بہتی ہے...... جہاں پر گنگا کی لہریں مسکراتی کھلکھلاتی رہتی ہیں، جمنا کے کنارے شان سے مسکراتا تاج محل، چاندنی راتوں میں جگمگاتا رہتا ہے۔

یقین کیجئے دل کھول کر قہقہے لگانا سب کے نصیب میں نہیں ہوتا۔ یہ صرف زندہ دل لوگوں کو ہی میسر ہے۔ ہنستے مسکراتے رہنے سے حیات بڑھتی ہے۔ رگوں میں منجمد ہو جانے والا لہو بھی ہنسی کے ارتعاش سے متحرک ہو جاتا ہے اور تجدید حیات ہونے لگتی ہے۔ مزاحیہ مضامین (ناچیز کے بھی) لطیفے برجستہ اور شائستہ مذاق یقیناً آپ کو ہنستا مسکراتا رکھے گا۔

ہماری ایک دوست ہیں، وہ اکثر طنز و مزاح کے مضامین پڑھتی رہتی ہیں اور تنہا ہی قہقہے لگاتی رہتی ہیں۔ کئی بار ان کے گھر والے دماغی ڈاکٹر کے پاس لے گئے لیکن ڈاکٹر نے انھیں "خوش مزاج" کہہ کر لوٹا دیا۔

مختلف مسائل انسان کے ذہن میں ہوتے ہیں۔ ذرا ہنس لینے سے طبیعت بہل جاتی ہے اور پھر آپ خود میں نئی توانائی محسوس کرنے لگتے ہیں، ہے نا؟

عیبوں کے ہنر بن جانے کا دور تو آپ دیکھ ہی رہے ہیں، راستہ چلتے ہوئے اگر کوئی گر جائے تو آس پاس کے لوگ قہقہے لگاتے ہیں بجائے اس کے کہ گرنے والے کو اٹھایا جائے۔

آپ اگر خوش اخلاقی کا مظاہرہ کرنے کیلئے کسی محفل میں مسکرانا چاہیں تو آپ کی مسکراہٹ ایسی نظر آتی ہے جیسے کہ آپ کے پاؤں میں کیل چبھ گئی ہو اور آپ تکلیف سے آہ کرنے والے ہوں .....!

ہم نے آپ کو ہنسنے کا مشورہ تو دے دیا لیکن اس کے طریقے نہیں بتائے دیکھئے جب کوئی آپ سے آپ کا نام پوچھے تا، تو ہنستے ہوئے نام بتا دیجئے۔ پوچھنے والا بھی ہنس دے گا (متحیر ہو کر) اگر آپ کی خیر و عافیت پوچھی جائے تو پہلے زور دار قہقہہ لگائیے، پھر کہئے "اللہ کا کرم ہے" سامنے والا اور بھی حیران ہو گا۔ (آپ کی دماغی حالت پر شک بھی کرے گا)

مزید تفصیلات کوئی پوچھے تو مسلسل قہقہے لگاتے جائیے اور سناتے جائیے دیکھئے کہ مقابل پر کیا گزرتی ہے؟

کبھی کسی کی عیادت کے لئے جانا ہو تو بہرِ عیادت قہقہوں کی بارش کیجئے جب تک کہ دواخانے کا عملہ آپ کو روم سے باہر نہ کر دے۔

اگر خدا نہ کرے کسی کی تعزیت میں جانا ہو تو پہلے حسب روایت آنسو بہائیے پھر صبر کی تلقین کیجئے۔ پھر ذرا دیر چپ ہو کر ہلکے سے مسکرائیے۔ اس کے بعد موت و حیات

پر تبصرہ کرتے ہوئے یہ شعر پڑھئے ؎

قیدِ ہستی سے کب نجات جگر
موت آئی، اگر حیات گئی

اور پھر بے ساختہ یوں ہنس پڑیئے جیسے آپ زندگی پر ہنس رہے ہوں۔ اگر صاحبِ خانہ آپ کا ساتھ دے تو ٹھیک ہے ورنہ چپکے سے کھسک جائیے.....!

کسی شادی خانہ آبادی میں تو آپ کو پوری آزادی ہے کہ جی بھر کے قہقہے لگائیں اور زور زور سے لگائیں تاوقتیکہ آپ کے ہونٹوں پر لگی "لپ اسٹک" آپ کے رخساروں تک پہنچ جائے۔ کاجل لگی آنکھوں میں ہنسی خوشی کے فوارے پھوٹنے تک آپ کی ہنسی کو نہیں رکنا چاہیے، لیکن سلامی دیتے وقت خدارا نہ ہنسئے گا ورنہ لوگ سمجھیں گے کہ......؟

کبھی دلہن کی وداعی تقریب کے وقت جب دلہن کے قریبی عزیز زار زار رونے لگیں تو آپ دلہن کے تابناک مستقبل کی پیش قیاسی کرتے ہوئے فراخ دلی سے اس طرح قہقہے لگائیے کہ روتی ہوئی دلہن بھی ذرا دیر ہنسنے پہ مجبور ہو جائے.....!

ایک بار کہیں جاتے ہوئے ہمیں نہ جانے کیا یاد آگیا کہ ہم بے اختیار ہنس پڑے۔ ہم اس وقت پیدل تھے، بالکل پیدل، ہماری ہنسی رکنے کا نام نہیں لے رہی تھی (ہم خیالوں کی دنیا میں رہنے والے جو ٹھہرے) کچھ آگے جانے کے بعد ہمیں آگے راستہ تنگ سا محسوس ہوا۔ ہم ٹھٹک کر رک گئے۔ کچھ منچلے لڑکے، لڑکیاں ہمارے آگے پیچھے شور مچا رہے تھے، وہ ہمیں پاگل سمجھ رہے تھے اس کے باوجود ہماری نامراد ہنسی رکنے کا نام نہیں لے رہی تھی، ہم نے کئی آٹو رکشا روکے مگر ہم دیکھتے ہی آٹو والے بھی تیزی

سے گذر جانے لگے کہ شائد ہم مذاق کر رہے ہوں۔ بڑی مشکل سے ایک آٹو ہمارے اشارے پر رکا، ہم آٹو میں بیٹھ گئے۔ اب کسی حد تک ہماری ہنسی کم ہوئی۔ کچھ آگے جاکر آٹو والے نے قہقہے لگانے شروع کئے۔ ہم نے وجہ پوچھی، تو اُس نے جواب میں اور زور سے قہقہے لگانے شروع کئے۔ ہم نے پوچھا تو اُس نے اور زور سے ہنسنا شروع کیا۔ ہم پریشان ہو گئے۔ آٹو والے کے سر پر زخموں کے پُرانے نشان تھے اور حلیہ پاگل خانے سے بھاگ نکلنے والوں کا ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ !

اِس پریشانی کے عالم میں ہم نے چلتے ہوئے آٹو سے چھلانگ لگا دی۔ ہم زخمی ہوئے یا نہیں۔ یہ آپ خود سمجھ جائیے۔ مگر ہم ہنسنے والوں سے ابھی تک گھبراتے ہیں۔ اُس پاگل آٹو رکشا والے نے ہمیں سمجھا دیا کہ بے وجہ ہنسنے کو پاگل پن کہتے ہیں اور اس لئے ہم کسی آٹو میں ابھی تک نہیں بیٹھے۔ مگر ہنستے ضرور ہیں، گھر میں یا کبھی تنہائی میں ہنس کر "تجدیدِ حیات" کر لیتے ہیں، کیا کریں سرِ محفل ہنسنا معیوب سمجھا جاتا ہے نا —— ؟ ■■

"نیند ہماری ....."

ہمیں اس بات پر بہت ناز ہے کہ ہم بہت گہری نیند سوتے ہیں۔
ہم عام لوگوں کی طرح "سرسراہٹ" سے جاگنے والوں میں نہیں، بلکہ ہم تو اُن بے جگر لوگوں میں سے ہیں جو نکسلائٹس اور پولیس کی گولیوں اور بموں کے دھماکوں کے درمیان بھی سوئے رہتے ہیں۔ دھماکے ہمارے نزدیک اہمیت نہیں رکھتے۔ اونہہ، یہ بھی کوئی بات ہوئی کہ رات کے سناٹے میں کوئی زوردار آواز سُن کر گھبرا کے اُٹھ جائیں اور سارے گھر والوں کو پریشان کر ڈالیں اور اتنی ذرا سی بات پر خوابوں کے حسین نگر سے دوڑے چلے آئیں۔

ہمارے پاس نیند بڑی فرصت سے آتی ہے اور وہ خوابوں کے رنگین پٹارے سے کئی خواب نکال کر ہمیں دیتی ہے اور ہم اُن خوابوں کو اُلٹ پلٹ کر دیکھنے میں منہمک ہو جاتے ہیں۔

اِن خوابوں کے دامن رنگ برنگے ستاروں سے آراستہ ہوتے ہیں۔ ہم ستاروں کی اس خاموش دنیا میں بڑے سکون سے جمے رہتے ہیں جہاں روشنی دبے پاؤں چلتی ہوئی ہمارے قریب آجاتی ہے اور ہم روشنی کو دستک دے کر دوبارہ آنے کی تاکید کر کے رخصت کر دیتے ہیں۔ خاموشیوں کو توڑتی، اندھیروں کو چیرتی صبح ہمیں جگا دیتی ہے مگر ہم رات کے فسوں سے پھر بھی پیچھا نہیں چھڑا پاتے اور پھر

یہ ہوتا ہے کہ مسلسل گھر والے سوال کرنے لگتے ہیں کہ آخر ہم ایسی نیند کیوں سوتے ہیں کہ حالات کی خبر ہی نہیں ہوتی ؟

ایک دفعہ ہمیں بتایا گیا کہ بازو کے میدان میں رات کو تعمیر کے لئے برما لگایا گیا تھا، کئی زور دار دھماکوں سے آس پاس کی بلڈنگیں دہل گئیں، لوگ "زلزلہ" سمجھ کر باہر نکل پڑے لیکن ہم تھے کہ "ادائے بے نیازی" سے سوتے ہی رہے اس وحشت میں بھلا کون کسے پوچھتا ہے ؟ جب دھماکوں کی اطلاع پولیس اسٹیشن تک پہنچی تو پولیس نے آکر وہ دھماکے رکوا دئیے اور لوگوں کی جان میں جان آئی۔ جب ہماری تلاش شروع ہوئی تو ہم اس ہجوم میں نہیں پائے گئے۔ کسی نے واپس ہمارے بیڈ روم میں آکر ہمیں دیکھا، ہم دھماکوں کے ارتعاش سے اپنے پلنگ کے نیچے گر پڑے تھے لیکن نیند نہیں ٹوٹی تھی۔ گھر والے یہ سمجھے کہ ہم "گذر گئے" ہلکی ہلکی سسکیوں کی لہریں زور دار ہچکیوں میں تبدیل ہوگئیں۔ ہم نے پھر بھی جنبش نہیں کی، نہ جانے کب ہمیں ہال کے وسط میں اُٹھا کر رکھا گیا۔ کسی "جہاندیدہ" نے ہماری نبض اور دل کی دھڑکن محسوس کی اور نعرہ بلند ہوا کہ "ہم زندہ ہیں"۔ ہمارے گھر میں خوشیوں کے دریا اُبل پڑے۔ روتے چہرے مسکرانے لگے۔ ہمیں بچوں نے دبوچ لیا کہ ہم واقعی "گذر" نہ جائیں۔ منہ پر جب سارا ٹھنڈا پانی اُنڈیلا تو ہم جاگے، سب تالیاں بجا رہے تھے جیسے کہ ہم نے "موت کے کنوئیں" میں چھلانگ لگا کر کوئی کرتب دکھایا ہو، لیکن واقعی کرتب دکھانے کی گھڑی تو اب ہمارے سر پر تھی، ہمیں مُردہ سمجھ کر ہمارے پاؤں کے انگوٹھے باندھ دئیے گئے تھے ہم نے اُٹھ کر چلنے کی کوشش کی تو دھڑام سے اوندھے منہ گر پڑے....

توبہ، توبہ ہماری جیسی ہستیاں گرنے کے لئے نہیں بنائی جاتیں، ارے ہم تو وہ چیز ہیں جس سے پہاڑ بھی ٹکرا کر پاش پاش ہو جاتے ہیں۔ ہائے، مگر آج ہم اوندھے منہ گر پڑے تھے اور گر کر اُٹھ بھی نہ سکے۔ ہماری ناک سے خون بہہ رہا تھا ہمارا منہ زخمی ہو گیا تھا، کیونکہ دانت بھی اپنے تھے اور ہونٹ بھی اپنے ......! خیر پاؤں کے انگوٹھے کھول دیئے گئے، ہم "شترِ بے مہار" کی طرح اُس عمر رسیدہ خاتون کی طرف لپکے جن کی قیاس آرائی نے ہمیں مُردہ قرار دیا تھا وہ خاتون گھبرا کر حمام میں جا گھسیں اور اندر سے دروازہ بند کر لیا۔ ہم نے جوش میں پلٹا کھایا تو ٹکرا گئے اپنے نامدار سے ...... ہمارے بالوں کو انھوں نے مٹھی میں پکڑ کر جھٹکا دیتے ہوئے سخت لہجے میں کہا، ہوش میں آؤ...! یہ جملہ بالوں کی گرفت سے زیادہ طاقتور تھا۔ ہم واقعی ہوش میں آ گئے، کیونکہ گھر کے سب چھوٹے بڑے افراد ہمارا مذاق اُڑا رہے تھے اور ہم اپنے بال اپنے .... نامدار سے چھڑانے کی کوشش میں مرے جا رہے تھے۔

خدا خدا کر کے حالات موافق ہوئے۔ دو، تین گھنٹے بعد دھماکہ جیسی آواز نے ہمیں چونکا دیا (ہم جاگ رہے تھے نا! اس لئے)۔ حمام میں بند ہونے والی خاتون کافی دیر سے دروازہ پیٹ رہی تھی۔ ہم نے غصہ میں اُس وقت دروازہ باہر سے بند کر دیا تھا بہرحال جب دروازہ کھولا گیا تو وہ پسینہ میں شرابور ہمارے اوپر ہی آ پڑیں اور بے ہوش ہو گئیں۔ ہم دل ہی دل میں خوش ہوئے کہ اُس خاتون سے انتقام لے ہی لیا جنھوں نے ہمیں "مُردہ" قرار دیا تھا۔ اگر واقعی ہمیں مُردہ سمجھ کر "زندہ در گور" کر دیا جاتا تو ہم آج آپ کو اپنی نیند کے بارے میں کیسے بتا سکتے؟ ہے نا ....

"ہنسی آتی ہے"

دیکھیئے صاحب! ہم کوئی تجوری و جوری نہیں رکھتے۔ نہ ہم ساہوکاروں کی طرح بڑی بڑی فولادی الماریوں کے مالک ہیں۔ نہ ہم نے گھر کے آنگن یا دیواروں میں سونے کی اینٹیں دفن کر رکھی ہیں، پھر بھی ہم اعلان کرتے ہیں اور با ہوش و حواس اعلان کرتے ہیں کہ ہم بہت مالا مال ہیں۔ یقیناً آپ کا تجسس بڑھ گیا ہوگا کہ آخر ہم مالدار کیسے ہیں؟ تو سُنیئے! ہم نے اپنے وجود میں بے شمار قہقہے چُھپا رکھے ہیں۔ جب ہمارا جی چاہتا ہے ہم انھیں نچھاور کرنے لگ جاتے ہیں مگر یہ ہم اُس وقت کرتے ہیں جب کوئی غم دوراں یا غم جاناں کی ماری ہستیاں نظر آئیں۔ ہم انھیں اس قدر ہنسا دیتے ہیں کہ وہ روتے روتے ہنس پڑتے ہیں اور یہ ہنسی کا تسلسل کچھ اتنا طویل ہو جاتا ہے کہ کبھی کبھی طبی امداد کی ضرورت بھی پڑ جاتی ہے..... اب آپ حیران ہو رہے ہوں گے کہ بھلا ہنسانا بھی ایسا کون سا ہنر ہے جو ہم اتنا ناز کر رہے ہیں؟

بات دراصل یہ ہے کہ جب کوئی حزن و ملال چہرے پہ طاری کیئے ہم سے ملتا ہے تو ہم پر ایک عجیب طرح کی کیفیت ہماری "چھٹی حس" ہم پر سایہ کر دیتی ہے اور ہم اُس کیفیت میں مبتلا ہو جاتے ہیں جسے ڈاکٹر اختلاج اور بزرگ "ہول دلی" کہتے ہیں۔ ہم یہ ٹھان لیتے ہیں کہ اِس موذی مرض کا علاج ہم

خود کریں گے ۔ ہم اپنے آپ کو خوش کرنے کے لئے دوسروں سے "لطیفہ بازی" جیسی گفتگو کرنے لگتے ہیں، جب مقابل ہنستے ہنستے بے قابو ہونے لگتا ہے تو ہمارے دل کو بڑا چین آجاتا ہے' "ہول دلی" اطمینان میں بدل جاتی ہے۔ اور ہم اور ہمارے مقابل باغ و بہار قہقہے لگاتے ہوئے حزن و ملال کے "آسیب" کو بھگا دیتے ہیں اور محفل کو قہقہہ زار کر دیتے ہیں۔ ہمارا یہ خیال ہے کہ اس طرح "تجدیدِ حیات" کرتے رہنے سے بالآخر ہم عمرِ خضر بھی حاصل کر ہی لیں گے۔ ہم اس مصرعہ کے قائل ہیں کہ ؎

"زندگی زندہ دلی کا نام ہے"

ہمارے پاس ہنسی کا سامان بہت ہے۔ اگر ہم اس کی تجارت شروع کر دیں تا! تو یقین کیجئے، دنیا کی سب سے بڑی "تاجر ہنسی" کہلائیں گے۔ ہم نے کئی بار اس تجارت کی کوشش کی لیکن خدا بھلا کرے خود غرضوں کا، خود تو ہم سے قہقہے لے لیتے ہیں، اور ہمیں آنسو دے ڈالتے ہیں۔ ہم چونکہ مسکراتے رہنے کے عادی ہیں، آنسو ہمارے چہرے سے میل نہیں کھاتے اور ہمارے چہرے کے خدوخال متفرق ہو جاتے ہیں، یعنی ہونٹوں پر ہنسی سجی رہتا ہے تو آنکھوں میں دوسروں کے آنسو، ہم بڑے مضحکہ خیز نظر آنے لگتے ہیں۔ اتنے زیادہ کہ ہمارے گھر والے بھی ہمیں پہچان نہیں پاتے ہمیں اپنی پہچان کے لئے یا تو آنسو روکنے پڑتے ہیں یا ہنسی۔ آنسو دوسروں کے ہوتے ہیں جن پر ہمارا قابو نہیں، ہنسی ہماری ہوتی ہے مگر اکثر بغاوت کر جاتی ہے۔ ہماری مجبوری پر بھی آپکو یقیناً ہنسی آرہی ہو گی کہ ہم ویسے تو باتیں بڑی بڑی کرتے ہیں مگر قابو ذرا بھی نہیں۔ اسکی ایک وجہ یہ بھی ہے کہ ہم اکثر اپنے تصور میں "زعفران کے کھیت" خود کو چہل قدمی کرتا ہوا پاتے ہیں۔ اگر آپ بھی

ہنسی کی قیمت

ہماری یہ عادت ہے کہ جب ہم اپنا کوئی افسانہ، مضمون یا غزل سناتے ہیں تو بہت ہی سعادت مندی سے سناتے ہیں یعنی سر جھکا ہوا، نظریں نیچی، اور کچھ کچھ گھبرائے ہوئے سے، اس سعادت مندی کی اصل وجہ آپ سن کر حیران ہو جائیں گے۔ ہماری کمزوری یہ ہے کہ سناتے وقت ہماری نظر اگر کسی چہرے پر پڑ جائے تو اُسے محوِ حیرت دیکھ کر ہمیں بے ساختہ ہنسی آجاتی ہے اور اتنی بے ساختگی سے آتی ہے کہ ہمارے چہرے پر پڑا ہوا سنجیدگی کا دبیز نقاب تار تار ہو جاتا ہے۔ "سرسوں پھولنے" کے بعد کی کیفیت تو آپ جانتے ہوں گے نا!

ہماری ہنسی پر ہمارا قابو ہی نہیں، ہمیں خبر ہی نہیں ہوتی کہ ہنسی کب ہمارے چہرے سے عیاں ہو جائے۔ محفلوں کا لحاظ کئے بغیر یہ کم بخت نہ جانے کیوں ہمارے ہونٹوں پر کھیلنے لگتی ہے۔ اپنے برابر کے لوگوں میں تو نبھ جاتی ہے لیکن جب بڑوں کے سامنے یہ کم بخت ہنسی رُکنے کا نام نہیں لیتی تو ہماری شامت ہی آجاتی ہے

ہم ایک بار اسے مرض سمجھ کر اپنی عقل مندی کا ثبوت دینے کے لئے ایک "ماہرِ نفسیات" کے پاس پہنچے۔ ڈاکٹر صاحب کو سلام کرتے کرتے ہم نے ایک نظر بہ حد احتیاط ایک نظر اُن کو دیکھا۔ "اے وحشتِ دل کیا کروں"... کا حلیہ لئے ہوئے وہ کچھ اس طرح ہماری جانب دیکھ رہے تھے کہ ہم قہقہہ مار کر ہنس پڑے اور

ہنستے ہی چلے گئے۔ ڈاکٹر صاحب نے نام پوچھا، ہم کچھ بتا نہ سکے۔ ہمارے پاس جواب میں قہقہے تھے صرف قہقہے ...... انھوں نے مسکراتے ہوئے ہم سے پوچھا، شکایت کیا ہے؟ ہم نے دل میں سوچا شکایت؟ وہ تو ہمیں کبھی کسی سے نہیں رہی، مگر جواب نہ دے سکے۔ ہمارے منہ سے ہنسی کا فوارہ جاری تھا جس میں اب ڈاکٹر صاحب بھی بھیگنے لگے تھے۔ ہمارے قہقہے اب فلک "شگاف" ہونے لگے تھے رفتہ رفتہ ڈاکٹر صاحب کے بھی دانت ہمیں نظر آنے لگے، باقاعدہ "جُگل بندی" شروع ہو گئی۔ ڈاکٹر صاحب ہم پر اور ہم ڈاکٹر صاحب پر ہنستے رہے۔ تقریباً آدھا گھنٹہ یہی حال رہا، پھر دھڑام سے دروازہ کھول کر ایک صاحب اندر چلے آئے۔ پتلون کے تسمے اُن کے کاندھے پر ٹنگے تھے، چشمہ غالباً ناک کے لئے ہی بنوایا تھا، وہ کچھ سمجھے، کچھ نہیں سمجھے مگر ہماری ہنسی میں شامل ہو گئے۔

"مطب" "ہنسی خانہ" بن گیا، ہم پوری طرح ہوش میں تھے مگر یہ کہ ہنسی پر قابو نہیں پا سکتے تھے۔ ہم نے جانے کا ارادہ کر کے اپنے پرس سے سو روپے کا نوٹ "بطور فیس" ڈاکٹر صاحب کی طرف بڑھایا۔ ڈاکٹر صاحب بھی کچھ نہیں کہہ پا رہے تھے۔ اُنہوں نے ہاتھ کے اشارے سے نوٹ واپس لینے کو کہا اور اپنے کوٹ کی جیب سے سو سو کے دو نوٹ ہمیں ڈاکٹر صاحب نے دیئے تھے، ہم بنا کچھ کہے وہاں سے چلے آئے، نوٹ تو ہم پہلے ہی پرس میں رکھ چکے تھے لیکن اب ہماری ہنسی رُک گئی تھی ہم کافی سنجیدہ ہو گئے تھے۔ آج تک یہ بات سمجھ میں نہیں آئی کہ ڈاکٹر صاحب نے فیس لینے کے بجائے ہمیں دی کیوں؟

ہم جب بھی ہنستے ہوئے یہ واقعہ یاد کرتے ہیں تو ہماری ہنسی رک جاتی ہے

اور ہم زعفران کے کھیت سے نکل کر مستانت کے چٹیل میدانوں میں بھٹکنے لگتے ہیں، اور یہ محسوس کرتے ہیں کہ ہنسی کی قیمت شائد دو سو روپے ہے یا پھر ہنسی ایسی متعدی بیماری ہے جو کسی کو بھی کسی وقت ہو سکتی ہے۔ لیکن اس کے سارے جراثیم ہمارے اندر ہی پائے جاتے ہیں جس کا علاج دو سو روپے ہے، وہ بھی اگر ماہر نفسیات ڈاکٹر دے تو ..... !!

جب ہم اناؤنسر بن جائیں گے

جیسے ہی ہمیں یہ معلوم ہوا کہ دوردرشن حیدرآباد سے اُردو میں بھی خبریں نشر کی جائیں گی، ہم عالم خیال میں پرواز کرنے لگے۔ دراصل ہمیں خبریں نشر کرنا بہت پسند ہے اور بات جب اُردو کی ہوتی ہے تو ہم بھی دل کی طرح خوشی سے بلیوں اُچھلنے لگتے ہیں۔ خیر چھوڑیئے! ہاں تو ہم نے سوچا جب ہم "اناؤنسر" بن جائیں گے تو پہلے ہی ہمارے دوست واقرباء کے علاوہ شہر کے بے حساب لوگ بھی ٹی۔ وی کے سامنے آنکھیں پھاڑ پھاڑ کر ہمیں دیکھ رہے ہوں گے اور ہم گرما گرم خبریں نشر کر رہے ہوں گے۔ خبروں کی ترتیب بھی ہم ہی کریں گے۔ کبھی ہم بم پھٹنے کی اطلاع دے کر ناظرین کو خوفزدہ کردیں گے، کبھی درجۂ حرارت کا اعلان کرکے لوگوں کو پسینے میں غرق کردیں گے۔ کبھی سردی کی لہر کا احساس دلاکر اُون کا کاروبار کرنے والوں کا بھلا کردیں گے، کبھی ہم بند کا اعلان کرکے نظام شہر درہم برہم کردیں گے، کبھی ہم کسی سیاسی لیڈر کے اغواء کی خبر سناکر امن پسند شہریوں کو خطرے کا احساس دلائیں گے، کبھی ڈکیتی کی مسلسل وارداتوں پر تشویش کا اظہار کرکے لوگوں میں ہراسانی پھیلائیں گے۔ کبھی ہم کسی مذہبی جلوس کی خبر دے کر دلوں میں جوش وخروش پیدا کردیں گے تو کبھی "ایرانڈیا" کے عملہ کی اچانک ہڑتال کی خبر دے کر بہت سی پروازیں روک دیں گے۔ کبھی ہم کسی نئی سرکاری عمارت کے افتتاح کی تاریخ مقرر ہونے کی اطلاع دیں گے تو کبھی شہر کی کسی بڑی شخصیت کے سانحۂ ارتحال سے متعلق

خبر بادیدۂ نم سنا کر ناظرین کو کبھی غم زدہ کر دیں گے۔ کبھی کسی ٹرین کے حادثہ کی خبر دے کر لوگوں کو پریشان کر دیں گے تو کبھی چاول کی قیمت کم ہونے کی خوشخبری سنا کر سب کو خوش کر دیں گے۔ سرکاری دواخانوں میں نئے طریقۂ علاج کی مشین دکھاتے ہوئے مریضوں کی تسلی کا باعث بن جائیں گے تو کبھی سونے، چاندی کے بھاؤ کا اونچ نیچ سمجھائیں گے۔ کبھی آنے والے طوفان کا پیش خیمہ کرتے ہوئے بچاؤ کی تدبیریں بھی سکھائیں گے۔ کبھی سورج یا چاند گہن کی پیش قیاسی کرتے ہوئے شہریوں کو مذہب پرستی میں مبتلا کر دیں گے۔ کبھی عید کی مبارکباد دیتے ہوئے شیر خورمہ بنانے پر سب کو مجبور کر دیں گے تو کبھی دیوالی کی مبارکباد دیوں کے چراغ روشن کروا دیں گے۔ شہر کے تمام لوگ ٹی۔وی کے سامنے ہماری "شبیہہ" دیکھتے ہوئے عقیدت سے سر جھکائے ہم پر رشک کر رہے ہوں گے کہ ہم کتنی بڑی بڑی ذمہ داریاں آسانی سے سنبھال لیا کرتے ہیں۔۔۔۔ ہے نا؟ ـــــ ہمیں یہ اندیشہ بھی ہے کہ ہم خبریں سناتے ہوئے بوکھلاہٹ کا شکار بھی ہو جائیں گے۔ لیکن یہ اعتماد بھی ہے کہ ناظرین و سامعین اپنی قابلیت سے ان لفظوں کو صحیح طور پر سمجھ لیں گے جنھیں ہم روانی اور بوکھلاہٹ میں اُلٹ پلٹ ادا کریں گے۔۔۔۔! اناؤنسر بننے کی خواہش اپنی جگہ، لیکن دل کے اندیشے کہیں ندامت نہ بن جائیں، یہی سوچ کر ہم ابھی سے اناؤنسر بننے کی مشق کر رہے ہیں۔ ہم گھر کے ہر فرد سے یوں بات کرنے لگے ہیں جیسے کہ خبریں نشر کر رہے ہوں۔ ملازمین ابھی پوری طرح ہماری اُردو سے واقف نہیں، اس لئے انہیں اپنی بات سمجھانے کیلئے عام بول چال کے انداز سے کام چلانا پڑ رہا ہے۔ ہمارے بچے اور ہمارے سرتاج تو اب ہماری قابلیت کا لوہا مانتے ہی والے ہیں۔ آپ بھی یقین کر لیجئے تاکہ "ہم اناؤنسر بن جائیں گے"ــــ!

●●

"بے محل"

جی ہاں! بے محل ہم خود ہیں۔ ہمارا محل وحل کچھ نہیں ہے لیکن ہمارے یہاں آنے والے شادی وغیرہ کے رقعوں پر ہم اپنے شوہر کے نام کے علاوہ جب "مع محل" لکھا ہوا دیکھتے ہیں تو ہمیں خود اپنے "محل" ہونے کا احساس ہوتا ہے۔ اب یہی دیکھ لیجئے کہ ہم تاج ہیں، ہیں نا؟ اور پھر محل بھی ہیں نا؟ اس طرح ہم "تاج محل" ہوئے نا! یعنی ایک شاہی مزار... دراصل ہمارے اندر بہت ساری چیزیں دفن ہیں، کئی مضامین، مزاحیہ خاکے، کئی غزلیں، کئی افسانے وغیرہ، لیکن ہم جب کبھی "گڑے مُردے" اکھاڑنے بیٹھتے ہیں تو مُردوں کے ڈھیر لگا دیتے ہیں اور ہمارا قلم انھیں زندہ کرنے لگتا ہے اور یہ قرطاس کے دامن پر خوش وضع "حشرات الارض" کی طرح لہرانے لگتے ہیں۔

تاج محل کے نقش و نگار کی طرزِ تعمیر دنیا کے عجوبوں میں شامل ہے، لیکن ہم ابھی تک عجوبوں کی فہرست میں شامل نہیں ہو پائے کیونکہ بے محل، تاج محل بنا دیا جائے تو کیا نقش و نگار سے اسے آراستہ کیا جا سکتا ہے؟ بالکل اسی طرح کیا ممکن ہے؟ ہرگز نہیں! لیکن ہم اس کوشش میں لگے ہیں کہ ہم اگر تاج محل کے بجائے تاج سمجھے جائیں تو بہتر ہوگا کیونکہ تاج کی اہمیت محل سے زیادہ ہوتی ہے، تاج جب تک سر پر نہ ہو محل بے محل ہوتا ہے۔ ہوتا ہے نا...! --

"لہجہ"

"لہجہ" لفظوں کے اعتبار سے اہم نہ سہی، لیکن معنوں کے اعتبار سے بہت اہم ہے، بہت زیادہ اہم ہے، دیکھئے نا! آپ چاہے کسی سے بات کر رہے ہوں، بالمشافہ یا پردے میں، یا فون پر گفتگو ہو رہی ہو، لہجے سے "مخاطب" کے چہرے کے اُتار چڑھاؤ بھی محسوس ہوتا ہے، ہے نا؟ ناگوار لہجہ، پُرخلوص لہجہ، تھکا ہوا سا لہجہ اپنے پن کا لہجہ، اجنبی سا لہجہ، نفرت کی بجلیوں سے کڑکتا لہجہ، محبت سے بھرپور آبشار کی طرح بہتا لہجہ، سوالیہ لہجہ، مغرور لہجہ، بے بسی کا لہجہ، شگفتہ لہجہ، سنجیدہ لہجہ، شوخ لہجہ، اب ہم کتنی قسمیں بتائیں لہجے کی؟ یاد ہی نہیں کہ ہم کن کن لہجوں کے دریا پار کر چکے ہیں، ایک اور لہجے کے بارے میں بتا دیں، وہ ہے کاٹ کھانے والا لہجہ....! گھبرائیے نہیں اس کاٹ کھانے والے لہجہ سے آپ کو پیٹ میں انجکشن قطعی نہیں لینے پڑیں گے، بلکہ اس کاٹنے والے لہجہ کے نشان بھی جسم پر نہیں ہوتے، ہاں مگر روح کچھ زخمی ہو جاتی ہے۔ ڈاکٹروں نے جسم کے سبھی زخموں کا علاج دریافت کر لیا ہے لیکن روح کے زخم وہ لوگ ابھی تک دیکھ نہیں پائے تو علاج کا سوال ہی کہاں پیدا ہوتا ہے، ہے نا!

ہم اس کاٹ کھانے والے لہجہ کی اکثر زد میں آتے رہتے ہیں، مگر داد دیجئے صاحبان! ہمارے دفاعی ذہن کی۔ ہم اپنے مقابل کی طرف اسی طرح کے لہجہ کے

تیر چلاتے ہیں اور اتنے چلاتے ہیں کہ مقابل کا لہجہ آخر نرم ہو ہی جاتا ہے، اور ہم دل ہی دل میں خود اپنے لہجہ پر قربان ہو جاتے ہیں۔ ساحر لدھیانوی کا ایک شعر ہے ؂

دنیا نے تجربات و حوادث کی شکل میں
جو کچھ مجھے دیا تھا وہ لوٹا رہا ہوں میں

ہم اسی شعر کے پوری طرح قائل ہیں اور ہم بھی اسی لہجہ کو اپنائے رہتے ہیں، جس لہجہ کا ہمارا مخاطب عادی ہوتا ہے، روح کے زخم نظر نہیں آتے، اس لئے ہم اس کی فکر نہیں کرتے۔ ہاں! اگر کسی نے ہم پر گستاخانہ لہجہ کی رائفل تان لی تو ہم رعب دار لہجہ کے مزائیلوں سے کام لینا شروع کر دیتے ہیں، چاہے کچھ ہو ہم مزائل پر مزائل مارتے چلے جاتے ہیں۔ ویسے ہمارے پاس حاکمانہ لہجہ کے بم، اور انتقامی لہجے کے دھماکے بھی موجود ہیں جس کا ہم نے کبھی استعمال نہیں کیا، یہ تو ہم نے صرف اپنے دفاع کے لئے رکھے ہیں اور آپ کو بھی اطلاعاً کہہ رہے ہیں کہ ہم بھی بہت سے لہجوں کے ہتھیار رکھتے ہیں مگر خاکسارانہ لہجہ ہی سے کام چل جاتا ہے اس لئے دوسرے لہجوں کا استعمال نہیں کرتے ۔۔ ٹھیک کرتے ہیں نا؟

▬ ▬

○